www.cpsglobal.org

June 2015 • No. 463 • Rs. 20

اگر آپ دوسروں کی ضرورت بن جائیں تو
آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083, 46521511
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹ 20
One year ₹ 200
Two years ₹ 400
Three years ₹ 600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

جون 2015

فہرست

فطرت کا ایک قانون

قرآن کی سورہ البقرۃ میں فطرت کا ایک قانون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (2:249) یعنی کتنے ہی چھوٹے گروہ، اللہ کے اذن سے بڑے گروہ پر غالب آتے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اذن کے لفظی معنی اجازت کے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ یہاں کسی پُراسرار معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ فطرت کے قانون (law of nature) کے معنی میں ہے۔ فطرت کا یہ قانون کیا ہے۔ فطرت کا یہ قانون وہی ہے جس کو صبر کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صبر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اقلیتی گروہ منفی ردّعمل میں مبتلا نہ ہو تو وہ اِس قابل ہوتا ہے کہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنے سے بڑے گروہ پر سبقت لے جائے۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی گروہ اقلیت (minority) میں ہوتا ہے تو اُس کو اکثریتی گروہ (majority) کی طرف سے مسلسل چیلنج کا سامنا پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال، اقلیتی گروہ کو تخلیقی گروہ (creative group) بنا دیتی ہے۔ اِس طرح اُس کا شعور جاگتا ہے۔ وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ عمل کے نئے نئے میدان تلاش کرے۔ وہ اپنے ذرائع کو زیادہ بہتر طور پر استعمال کرے۔ وہ اپنے آپ کو اور زیادہ تیار کرسکے۔ وہ اپنے عمل کی زیادہ دور رس منصوبہ بندی (planning) کرے۔ اِس طرح اُس کا اقلیت میں ہونا اُس کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اکثریت سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے۔ اور آخر کار اکثریت سے زیادہ ترقی حاصل کرلیتا ہے۔ یہ اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ نہیں، یہ فطرت کا ایک قانون ہے جو ہمیشہ اور ہر زمانے میں جاری رہتا ہے۔ دو قوموں کے درمیان بھی، اور ایک قوم کے اندر داخلی طور پر بھی، حتی کہ دو افراد کے درمیان بھی۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی کسی بھی صورت حال میں منفی سوچ میں مبتلا نہ ہو۔ وہ ہمیشہ صرف ایک کام کرے۔ فطرت کے قانون کو دریافت کرنا، اور اس کے مطابق اپنے عمل کا منصوبہ بنانا، یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ دوسرا ہر طریقہ صرف تباہی میں اضافہ کرنے والا ہے، نہ کہ کامیابی تک پہنچانے والا۔

شیطان کا وسوسہ

قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حسن سلوک کے ذریعہ اپنے دشمن کو اپنا دوست بنائیں۔اس کے فوراً بعد یہ الفاظ آئے ہیں: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (41:36) یعنی اگر شیطان تمھارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو تم اللہ کی پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اِس سیاق (context) میں، وسوسہ شیطان کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ جب حسن سلوک کرنے کا معاملہ پیش آئے اور تمھارا دل کسی شک میں پڑے یا کوئی تم کو فرضی اندیشہ بتا کر اس راہ سے ہٹانا چاہے، اس وقت تم اِس قسم کے خیال کو شیطان کا وسوسہ سمجھو اور شیطان کو اپنے سے دور بھگا کر اس معاملے میں اسلام کے اصول پر قائم رہو۔اِس سیاقِ کلام میں، وسوسۂ شیطان کا مطلب ہے— دشمن کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے طریقے پر شبہہ ڈالنا۔

مثال کے طور پر اگر ایسا ہو کہ کسی کو یہ طریقہ بتایا جائے کہ تم جس کو اپنا دشمن سمجھتے ہو، اس کی دشمنی سے بچنے کا قرآنی طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔اس کے بعد اگر وہ شخص یہ کہے کہ ایسا کرنے سے دشمن اور زیادہ جری ہو جائے گا، وہ ہمارے خلاف اور بھی زیادہ دشمنی کرے گا تو ایسا کرنا یقینی طور پر شیطان کا وسوسہ ہے۔ایسا بول عقل کا بول نہیں ہے، بلکہ شیطان کا بول ہے۔جو لوگ ایسا کہیں وہ اس کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ شیطان کے فریب میں آ گئے ہیں۔

برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرنا محض ایک اخلاقی بات نہیں۔ وہ فطرت کے قانون کے مطابق ایک کارگر تدبیر ہے۔یہ فطرت کا قانون ہے کہ جب اس کے ساتھ جوابی طریقہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ یک طرفہ طور پر حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے تو اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے، وہ ندامت میں مبتلا ہو کر اپنی اصلاح آپ کر لیتا ہے۔

ایک سنتِ رسول

قال ابن عمر لعائشة: أخبرينا بأعجب شيء رأيته من رسول الله صلى الله عليه وسلم، فبكت وقالت: كلّ أمره كان عجباً (الترغيب والترهيب: 666) یعنی عبد اللہ ابن عمر نے عائشہ سے کہا کہ مجھ کو یہ بتائیے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے عجیب چیز کیا دیکھی۔ یہ سن کر وہ رو پڑیں، اور کہا کہ آپ کی ہر بات عجیب ہوتی تھی۔ عجیب یہاں اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ ذہنی صفت کے معنی میں ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات میں ایک نیا پن ہوتا تھا، آپ کی ہر بات تعجب خیز حد تک رواجی فکر سے مختلف ہوتی تھی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلیقی فکر (creative thinking) کا معاملہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کامل درجے میں تخلیقی ذہن (creative mind) کی صفت رکھتے تھے۔ آپ کی اس صفت نے آپ کو اس قابل بنا دیا تھا کہ آپ چیزوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں۔ آپ چیزوں میں نئے پہلو کی نشاندہی کریں۔ آپ چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھیں، اور دوسروں کو اسے بتائیں۔

یہ تخلیقی فکر دراصل تدبر اور تفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ کی صفات کے بارے میں ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: كان هو طويل الصمت دائم الفكر متواتر الأحزان (تاريخ دمشق لابن عساكر: 3/337) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک خاموش رہتے تھے، آپ ہمیشہ غور وفکر میں رہتے تھے، آپ مسلسل طور پر غم کی کیفیت میں ہوتے تھے۔

اس روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت معلوم ہوتی ہے، یعنی مسلسل طور پر غور وفکر (contemplation) کی حالت میں رہنا۔ غور وفکر کا یہ معاملہ صرف خصائص نبوی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ رسول اللہ کی ایک قابلِ تقلید سنت کا معاملہ ہے۔ اس غور وفکر سے آدمی کے اندر گہرائی آتی ہے۔ یہ فکری گہرائی آدمی کے اندر وہ صفت پیدا کرتی ہے، جس کو تخلیقی فکر کہا جاتا ہے۔ ایسا آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دریافت کرے، وہ چیزوں کے نئے پہلو سے لوگوں کو باخبر کرے۔

معرفت ایک تخلیقی عمل

دین میں سب سے زیادہ اہمیت معرفتِ الٰہی (realization of God) کی ہے۔معرفت کوئی جامد چیز نہیں۔معرفت مسلسل طور پر ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔اس کو قرآن میں ازدیادِ ایمان (8:2) کہا گیا ہے۔اس اضافہ پذیر معرفت کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) موجود ہو۔اس کا جذبہ معرفت اتنا بڑھا ہوا ہو کہ ہر چیز سے اس کو معرفت کی غذا ملتی رہے۔

آل انڈیا ریڈیو پر ہر گھنٹہ خبریں آتی ہیں۔درمیان میں دوسرے پروگرام بھی آتے رہتے ہیں۔ایک دن میں نے ریڈیو کھولا تو ایک گانے والا ایک گیت گا رہا تھا، اس گیت کی ایک لائن یہ تھی:

برباد میں یہاں ہوں، آباد تو کہاں ہے

یہ الفاظ سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے انسان درد کی حالت میں ہے اور وہ اپنے رب کو پکار رہا ہے۔انسان اپنے خالق سے کہہ رہا ہے کہ تو نے پیدا کرکے مجھے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا جو میرا ہیبی ٹیٹ (habitat) نہ تھا۔اس دنیا میں درخت کو اس کا ہیبی ٹیٹ ملا ہوا ہے، مچھلی کو اس کا ہیبی ٹیٹ ملا ہوا ہے، حیوانات کو ان کا ہیبی ٹیٹ ملا ہوا ہے۔چنانچہ بقیہ دنیا میں احساس محرومی کا کوئی وجود نہیں۔محرومی کا احساس صرف انسان کا تجربہ ہے۔انسان کو پیدا ہونے کے بعد مسلسل طور پر احساس محرومی (sense of unfulfillment) میں جینا پڑتا ہے۔وہ ذہنی سکون سے محروم رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مرجاتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے مجھے قرآن کی سورہ التین یاد آئی۔اس سورہ پر غور کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے انسان، تیری یہ حالت اس لئے ہے کہ تو نے میرے کریشن پلان (creation plan) کو نہیں سمجھا۔اگر تو میرے تخلیقی منصوبے کو دریافت کرتا تو تو یہ جان لیتا کہ میں نے تیرے لئے ایک اجر غیر ممنون (unending reward) تیار کر رکھا ہے۔اس دریافت کے بعد تو یہ کرتا کہ اپنی ساری توجہ اپنے آپ کو اس انعام کا مستحق بنانے میں لگا دیتا۔

دعوت حق کے دو دَور

حضرت ابراہیم ایک پیغمبر تھے۔ ان کا زمانہ ساڑھے چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ ان کی ایک دعا وہ ہے جو انھوں نے تعمیر کعبہ کے وقت قدیم مکہ میں کی تھی۔ قرآن کے مطابق ان کے الفاظ یہ تھے: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (2:128) یعنی اے ہمارے رب، ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل میں سے اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا۔

اس ابراہیمی دعا کا ذکر بائبل میں اس طرح آیا ہے — (اور خداوند نے کہا) ابراہام سے یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہوگی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی:

> (And the Lord said) since Abraham shall surely become a great and mighty nation, and all the nations of the earth shall be blessed in him. (Genesis 18: 18)

تاریخی پس منظر کو شامل کرکے غور کیا جائے تو اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ آدم سے لے کر ابراہیم تک بہت سے پیغمبر آئے تاکہ وہ امر حق کا اعلان کریں، لیکن اس پوری مدت میں یہ خدائی مشن ایک انفرادی مشن بن کر رہ گیا۔ اب اللہ کو یہ مطلوب ہوا کہ امت (team) کی سطح پر اس کو انجام دیا جائے۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں ایک عمل (process) شروع ہوا۔ اس کے بعد ابراہیم اور اسماعیل اور ہاجرہ کی قربانیوں سے ایک نسل (بنو اسماعیل) تیار ہوئی، جس کے اندر ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں محمد بن عبد اللہ پیدا ہوئے۔ ان کی دعوتی کوشش سے بنو اسماعیل میں ایک مطلوب ٹیم بنی، جس کو ایک حدیث میں العصابۃ (مسند احمد: 221) کہا گیا ہے۔ اس العصابہ نے اپنے زمانے کے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے توحید کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کیا۔

یہ روایتی دور (traditional age) کی بات تھی۔ اب سائنسی دور (scientific age) کے تحت نئے دعوتی مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ اب دوبارہ ایک العصابہ کی ضرورت ہے جو جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے نئے دور میں امرِ حق کا اظہار کرے۔

مطلوب رہنمائی

سچا رہنما کون ہے، امتِ موسیٰ کے حوالے سے قرآن میں اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے:
وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ (32:24) اور ہم نے ان میں امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔ قرآن کی اِس آیت میں ائمہ سے مراد مذہبی رہنما ہیں۔ یہاں یہ سوال ہے کہ قرآن میں ان کے لیے جعلنا کا لفظ کیوں آیا، یعنی اللہ کی طرف سے تقرری (appointment)۔ جیسا کہ معلوم ہے، اللہ کی طرف سے تقرری صرف پیغمبر کی ہوتی ہے۔ پھر غیر نبی امام کو اللہ کی طرف کیوں منسوب کیا گیا۔ اس سے مراد براہ راست تقرری نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد بالواسطہ تقرری ہے۔

اس بالواسطہ تقرری کا درجہ ان لوگوں کو ملتا ہے، جو صبر کا ثبوت دیں۔ اصل یہ ہے کہ رہنما دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو حالات کے ردعمل کے تحت (out of reaction) رہنمائی کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو صابرانہ منصوبہ بندی (patient planning) کے تحت رہنمائی کے لیے اٹھیں۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اللہ کے نزدیک درست رہنما ہیں، ان کو اللہ کی طرف سے قبولیت (acceptance) حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے رہنماؤں کے معاملہ کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ امت کی رہنمائی کا معاملہ اصولی طور پر نظریہ کا معاملہ ہے، اور عملی طور پر وہ حالات کا معاملہ ہے۔ حالات کا رخ انسان کی آزادی اور مسابقت (competition) سے تعلق رکھتا ہے۔ خارجی حالات کبھی اہلِ اسلام کے موافق نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رہنمائی نام ہے، ناموافق حالات میں اپنے لیے موافق راستہ تلاش کرنا۔ ایسی حالت میں رہنما ہمیشہ دو انتخاب (options) کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ حالات کے خلاف ردعمل (reaction) کرتے ہوئے کچھ جوابی سرگرمی شروع کردینا۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک غیر مطلوب رہنما ہیں، وہ کبھی اللہ کے نزدیک ربانی امام کا درجہ نہیں پاسکتے۔ دوسرے رہنما وہ ہیں جو صابرانہ منصوبہ بندی کے تحت اپنے عمل کا تعین کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نزدیک ربانی امام کا درجہ پائیں گے۔

حقیقت پسندانہ پالیسی کا کرشمہ

لی کوان یئو (Lee Kuan Yew) سنگاپور کے فاؤنڈر پرائم منسٹر تھے۔ وہ 91 سال کی عمر میں 23 مارچ 2015 کو سنگاپور میں وفات پاگیے۔ سنگاپور پہلے جغرافی اعتبار سے ملیشیا کا ایک سرحدی حصہ تھا۔ 1965 میں وہ ایک علاحدہ ملک (separate state) بنا۔ مسٹر لی سنگاپور کے پہلے پرائم منسٹر بنائے گیے تھے۔ اُس وقت سنگاپور ایک غیر ترقی یافتہ ملک تھا، اور وسائل سے محروم بھی۔ مگر مسٹر لی نے سنگاپور کو صرف پہلی جنریشن میں اول درجے کا ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔

آج سنگاپور میں ہر طرف ڈیولپمنٹ کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سنگاپور کے ایک تعلیم یافتہ باشندے نے ایک اخباری رپورٹر سے بات چیت کے دوران کہا کہ جو لوگ یہاں مسٹر لی کی یادگار (monument) دیکھنا چاہتے ہیں، سنگاپور کے لوگ فخر کے ساتھ ان سے کہیں گے کہ اپنے چاروں طرف دیکھو، سنگاپور کا ہر گوشہ مسٹر لی کی روشن یادگار ہے۔

> "To those who seek Lee Kuan Yew's monument, Singaporeans can reply proudly: Look around you."
> (*The Times of India,* Delhi, March 30, 2015, p.16)

سنگاپور کی ترقی جدید تاریخ کا ایک معلوم واقعہ ہے۔ مگر اس ترقی کو عام طور پر لوگ ایک شخص کا کارنامہ بتاتے ہیں، یعنی سنگاپور کے پہلے وزیر اعظم کا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ ایک انسان کا شخصی کارنامہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک انسان کی اختیار کردہ درست پالیسی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مسٹر لی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے ذریعے ممکن (possible) اور ناممکن (impossible) کے فرق کو جانا۔ انھوں نے اس حقیقت کو دریافت کیا کہ سنگاپور کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنی نیشنل پالیسی کو مثبت بنیادوں پر قائم کرے۔ سنگاپور نہ ملیشیا سے ٹکراؤ کرے، نہ وسائل کے مفقود ہونے کی شکایت کرے۔ نہ یہ کرے کہ کسی سازش (conspiracy) کو دریافت کرکے اپنے مفروضہ دشمن کے ظلم کا تحریری اور تقریری پروپیگنڈہ کرے۔

مسٹر لی نے اس قسم کی کسی منفی سوچ کا مکمل طور پر خاتمہ کردیا۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ سنگاپور کے دستیاب وسائل (available resource) کو دانش مندانہ پلاننگ کے ذریعے ڈیولپ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کسی غیر حاصل شدہ کو حاصل کرنے پر ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے صرف حاصل شدہ کی بنیاد پر اپنا منصوبہ بنایا نہ کہ غیر حاصل شدہ کی بنیاد پر۔

اس پالیسی کا نام مثبت پالیسی ہے۔ یہی مثبت پالیسی تھی جس نے مسٹر لی کو یہ موقع دیا کہ وہ مختصر مدت میں ڈیولپمنٹ کا ایک ایسا کارنامہ انجام دیں، جس کی مثال کسی اور ملک میں مشکل سے ملے گی۔

یہ دنیا فطرت کے قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، ہر ایک کے لیے ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ فطرت کے اس ابدی قانون کو دریافت کرے اور اس کے مطابق اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔ جس طرح اس دنیا کا خالق خدا ہے، اسی طرح دنیا کا نظام بھی خالق کے منصوبے کے مطابق چل رہا ہے۔ اس دنیا کے بارے میں خالق کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ فطری طور پر جو مواقع آدمی کو حاصل ہیں، ان کو دریافت کرکے انھیں ترقی دینا، نہ کہ غیر حاصل شدہ مواقع کے لیے بے فائدہ پروٹسٹ کرنا۔

سنگاپور نسبتاً ایک چھوٹا جزیرہ ہے، اس کی حیثیت صرف ایک سٹی اسٹیٹ کی ہے۔ اس اعتبار سے سنگاپور کا بظاہر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ سنگاپور کا رقبہ بڑھایا جائے۔ لیکن سنگاپور کے دانش مند لیڈر نے اس حقیقت کو جانا کہ موجودہ زمانہ نئے امکانات کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں اگر آپ کے پاس محدود رقبۂ زمین ہے تو آپ ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے ذریعے عمودی توسیع (vertical growth) کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس صرف ایک مقامی آفس ہے تو آپ ماڈرن کمیونی کیشن کے ذریعے اس کی پہنچ کو سارے عالم تک وسیع کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اپنے ملک میں تجارت کے مواقع کم ہیں تو آپ سی پورٹ اور ایرپورٹ کے ذریعے اپنی تجارت کو عالمی دائرے میں پھیلا سکتے ہیں، وغیرہ۔ سنگاپور کے دانش مند لیڈر نے نئے امکانات کو دریافت کیا اور ان کو بھرپور طور پر استعمال کیا، اور دنیا نے دیکھا کہ محدود مدت کے اندر سنگاپور ایک اعلیٰ ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔

اسی کے ساتھ دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہونے کی بنا پر صرف یہ کررہے ہیں کہ انھوں نے دوسری قوموں کو اپنا دشمن فرض کر رکھا ہے۔ وہ اپنی طاقت دوسری قوموں سے لڑنے میں ضائع کررہے ہیں۔ وہ دوسروں سے صرف نفرت کرتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ نئے امکانات کو جانتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ نئے حالات نے دوسروں کو ان کا مددگار بنا دیا ہے۔ وہ دوسروں کا سپورٹ لے کر اپنے آپ کو اعلیٰ ترقی کے منازل تک پہنچا سکتے ہیں۔

فطرت کے قانون کے مطابق اس دنیا میں ترقی کا راز یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مفروضہ ظالموں کو دریافت کریں، آپ یہ دریافت کریں کہ آپ کے خلاف کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی دریافتیں صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے نہ فطرت کے قانون کو جانا، اور نہ زمانے کے مواقع (opportunities) کو سمجھا۔ آپ خدا شناسی سے بھی محروم ہیں، اور انسان شناسی سے بھی۔ مگر اس دنیا کے لیے اس کے خالق کا قانون یہ ہے کہ جو حقائق (realities) سے باخبر ہو، وہ کامیابی کی تاریخ بنائے، اور جو شخص یا قوم حقائق سے بے خبر ہو وہ دنیا میں صرف شکایت اور احتجاج کرنے والا ایک محروم گروہ بن کر رہ جائے۔

دورِ مواصلات

قرآن کی سورہ بنی اسرائیل میں ایک آیت آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (17:70) یعنی ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی، اور سواری دی اس کو خشکی اور دریا میں۔

تمام حیوان اپنے پیروں کے ذریعہ سفر کرتے ہیں، چڑیا کا سفر اپنے پر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ خارجی سواری کے ذریعہ اپنا سفر کرسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جدید مواصلات (modern communication) کی ایجاد نے سواری (transportation) کے تصور کو بہت بڑھا دیا ہے۔ آج کے انسان کے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ جسمانی حمل ونقل (physical transportation) سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرے اور اِسی کے ساتھ افکار کے حمل ونقل (transportation of ideas) کو بھی نہایت سرعتِ رفتار سے انجام دے سکے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں براہِ راست طور پر صرف حیوانی مواصلات کا ذکر ہے، مگر بالواسطہ طور پر اس میں ہر قسم کے مواصلات بشمول مواصلات بذریعہ ٹکنالوجی کا اشارہ موجود ہے۔ آدمی اگر اس آیت کو اس کے توسیعی مفہوم (extended meaning) کے ساتھ پڑھے تو یہ آیت اس کے لیے کائناتی معرفت کا ذریعہ بن جائے گی۔ اِس آیت میں وہ اللہ کی کائناتی نعمت کو دریافت کرے گا۔ یہ ایک آیت اس کے لیے بلین ٹریلین سے بھی زیادہ معانی کا خزانہ بن جائے گی۔

قرآن معروف معنوں میں کوئی معلوماتی کتاب نہیں۔ لیکن قرآن کے اندر وہ تمام معلومات موجود ہیں جن کا تعلق معرفت سے ہے۔ یہ معلومات زیادہ تر اشارات کی صورت میں ہیں۔ ان آیتوں پر غور کرکے ان کے اندر چھپے ہوئے معانی کی دریافت کی جاسکتی ہے۔ یہی تدبر اور تفکر وہ چیز ہے جس سے معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کے ایمان کو یقین کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تدبر کو نصیحت کا ذریعہ بتایا گیا ہے (38:29)۔

دعوت فرضِ عین یا فرضِ کفایہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام فرضِ کفایہ ہے، وہ فرضِ عین نہیں، یعنی اگر کچھ لوگ دعوت کا کام انجام دیں تو بقیہ لوگوں سے اُس کی فرضیت ساقط ہوجائے گی۔ یہ تصور یقینی طور پر ایک بے بنیاد تصور ہے۔

جہاں تک فرضِ عین کا تعلق ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ فرضِ عین وہ ہے جس کی ادائیگی ہر فرد کے لیے ضروری ہے اور جس کی ادائیگی کے بغیر کسی انسان کی اخروی نجات ممکن نہیں۔ مثلاً نماز فرض عین ہے اور متفقہ طور پر ترکِ نماز سے آدمی کی نجات یقینی طور پر مشتبہ ہوجاتی ہے۔ یہی معاملہ دعوت الی اللہ کا ہے۔

دعوت الی اللہ کیا ہے، وہ دراصل ''ختم نبوت'' کے عقیدے کا جز ہے۔ جب ایک صاحبِ ایمان یہ اقرار کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے تو اس کے بعد اُس کے اوپر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ خاتم النبیین کے بعد آپ کے پیغام کو بعد کی نسلوں میں جاری رکھے۔ نبوت بلاشبہہ ختم ہوگئی، لیکن کارِ نبوت بدستور جاری ہے۔ دعوت الی اللہ کا مقصد اِس کارِ نبوت کو مسلسل نسل درنسل جاری رکھنا ہے۔ اس لیے دعوت الی اللہ کا کام ایک مسلسل کام ہے نہ کہ کوئی وقتی کام۔

دعوت فرض عین ہے یا فرض کفایہ کا سوال اس وقت ہوتا ہے، جب کہ دعوت کو محض اعلانِ غیر کے معنی میں لیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دعوت ایک شخصی عبادت ہے۔ دعوت کا نہایت گہرا تعلق انسان کی ذاتی تربیت اور ذاتی طور پر تعمیر شخصیت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام کیے بغیر کسی مومن کی مومنانہ شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی، کسی مومن کے اندر وہ اعلیٰ شخصیت نہیں بنتی جو آخرت کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ داعی ایک اعتبار سے دوسروں کو سچائی کا پیغام پہنچاتا ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ خود اپنے آپ کو سچائی پر کھڑا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ آخرت میں اس کو مقعدِ صدق (seat of truth) پر جگہ پانے کا اعزاز حاصل ہو۔

شہادت امتِ مسلمہ کا مشن

شہادت ایک عظیم عمل ہے۔ جولوگ شہادت کا عمل انجام دیں، ان کے لیے اللہ کے یہاں عظیم درجات ہیں۔ ان کو جنت کے اعلیٰ درجات میں جگہ ملے گی۔ شہادت کیا ہے۔ شہادت عین وہی چیز ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو پرامن طور پر اللہ کے بندوں تک پہنچانا۔ زندگی کی حقیقت (reality of life) سے انسان کو اُس کی قابلِ فہم زبان میں باخبر کرنا۔ شہادت یا دعوت کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کے اندر طلب ہو وہ اللہ کے نقشۂ تخلیق کو جان لے۔ اور جس کے اندر طلب نہ ہو اس پر اللہ کی حجت قائم ہو جائے، اس کو یہ موقع نہ رہے کہ وہ آخرت کے دن یہ کہہ سکے کہ ہم کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ خالق کا مطلوب ہمارے بارے میں کیا تھا۔ شہادت یا دعوتی مشن کو قرآن میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، مثلاً تبلیغ (5:67) یا انذار وتبشیر (4:165)، وغیرہ۔

شہادت کا لفظی مطلب گواہی دینا (to witness) ہے۔ شہادت اور دعوت دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے لیکن شہادت کے لفظ میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی دعوت کے کام کو اس طرح کامل صورت میں انجام دینا کہ آدمی کا پورا وجود دعوت کا مکمل اظہار بن جائے۔

یہی شہادت ہے۔ شہادت کا یہ تصور قرآن میں اجنبی (alien) ہے کہ شہادت کے دو درجے ہیں— قولی شہادت اور عملی شہادت۔ یعنی تقریر اور تحریر سے شہادت کی ذمے داری ادا کرنا کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ مکمل نظام قائم کرکے لوگوں کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ کیا جائے۔ یہ نظامی تصورِ شہادت نہ قرآن میں کہیں مذکور ہے، اور نہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر نے اس کو انجام دیا، حتیٰ کہ پیغمبر آخر الزماں نے بھی نہیں۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم شاہد (45:33) تھے۔ آپ نے بلاشبہ کامل معنوں میں شہادتِ حق کا کام انجام دیا۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ مکمل نظام کا عملی مظاہرہ کرکے شہادت کا

فریضہ انجام دیں، نہ مکی دور میں نہ مدنی دور میں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہادت کا یہ کام، ایک ایسا کام ہے جس کو ''قول'' کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ داعی کامل معنوں میں ناصح اور امین (7:68) ہو۔ یعنی مدعو کی نسبت سے کامل خیر خواہ(well-wisher)، اور اللہ کی نسبت سے کامل امانت دار(honest)۔

شہادت کا تصور

قرآن میں شہادت کا لفظ مختلف مشتقات کی صورت میں 160 بار آیا ہے۔ ہر جگہ وہ گواہی (witness) کے معنی میں ہے۔ قرآن میں شہادت کا لفظ مختلف نسبت کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن ہر بار وہ اسی گواہی کے مفہوم میں آیا ہے، کسی اور مفہوم میں نہیں۔

قرآن کے مطابق، پیغمبر کا منصب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اوپر اللہ کا گواہ بنے۔ وہ پرامن فکری جدوجہد کے ذریعے لوگوں کو بتائے کہ اللہ نے ان کو کس لیے پیدا کیا ہے۔ اور آخرت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ ہر پیغمبر کا مشترک مقصد یہی تھا، اور ہر پیغمبر نے شہادت کے اس عمل کو مکمل طور پر غیر سیاسی انداز میں انجام دیا۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن کارِ نبوت بدستور باقی ہے۔ خاتم النبیین کے بعد تمام انسانی نسلوں کے لیے بھی یہی مطلوب ہے کہ ان کو پیغمبر کی نیابت میں اللہ کا پیغام بدستور پہنچایا جائے، اور قیامت تک پہنچایا جاتا رہے۔ یہ کام بعد کے زمانے میں امتِ محمدی کو انجام دینا ہے۔ یہ گویا نبی کے بعد نبی کے کارِ شہادت کا تسلسل ہے۔ اس عمل کی درست ادائیگی کی شرط یہ ہے کہ اس کو امانت اور خیر خواہی (7:68) کی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔

امانت یہ ہے کہ اصل پیغامِ خداوندی میں کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ کی جائے۔ اور نصح یہ ہے کہ اس کام کو یک طرفہ خیر خواہی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ تاکہ مخاطب کے لیے انکار کا کوئی معقول سبب باقی نہ رہے۔

امتِ وسط

امتِ محمدی کی اس ذمے داری کوقرآن کی سورہ نمبر 2 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرۃ:143)۔ یعنی اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تا کہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر، اور رسول ہو تم پر بتانے والا:

> Thus We have made you a middle nation, so that you may act as witnesses for mankind, and the Messenger may be a witness for you.

امتِ وسط کا مطلب بیچ کی امت (middle ummah) ہے۔ یعنی امتِ محمدی کی حیثیت خاتم النبیین اور بعد کی انسانی نسلوں کے درمیان بیچ کے نمائندہ کی ہے۔ اللہ کے دین کو خاتم النبیین سے لینا اور اس کو بعد کی نسلوں تک کسی اجرت کی امید کے بغیر قیامت تک پہنچاتے رہنا۔ اس پہنچانے کا مطلب صرف اعلان (announcement) نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کو قول بلیغ (4:63) کی زبان میں پہنچایا جائے۔ یعنی ایسے اسلوب میں جو لوگوں کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔

قرآن کی اس تعلیم کے مطابق موجودہ دنیا ہمیشہ کے لیے دار الدعوۃ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے مطابق نبوت محمدی اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو نسبت ہے وہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ امت کی حیثیت شاہد کی ہے، اور دوسرے انسانوں کی حیثیت مشہود (85:3) کی۔ اس نسبت کو دوسرے الفاظ میں داعی اور مدعو کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔

امت محمدی کی اس دعوتی ذمے داری کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: المؤمنون شهداء الله في الأرض (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2642)۔ یعنی اہل ایمان زمین پر اللہ کے گواہ ہیں۔ شہادت کا یہ کام خالص پیغمبرانہ طریقے پر انجام دینا ہے۔ یہ ایک خدائی کام ہے جس میں کسی سیاسی یا قومی یا مادی مقصد کو شامل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اس کام میں کسی اور مقصد کو شامل کیا جائے تو وہ

قرآن کے الفاظ میں رکون ہوگا جو انسان کو اللہ کے یہاں سخت مواخذہ کا مستحق بنا دیتا ہے۔وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (11:113) یعنی ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

دعوت قولِ بلیغ کی زبان میں

شہادت یا دعوت کا یہ کام ایک ابدی قسم کا پیغمبرانہ مشن ہے۔ اس کو ہر زمانے میں مسلسل طور پر انجام دینا ہے۔ اس مشن کا اصل پیغام تو ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ لیکن زمانی تبدیلیوں کے اعتبار سے اس کی ادائیگی میں فرق ہوتا رہے گا۔ شہادت یا دعوت کے اس عمل کی ادائیگی کو موثر بنانے کے لیے اس طرح انجام دینا ہوگا کہ وہ ہر زمانے کے ذہن کو ایڈریس کر سکے۔ اس زمانی رعایت کے بغیر حجت کی شرط پوری نہیں ہوسکتی، جو کہ اس کام کی حسن ادائیگی کی لازمی شرط ہے۔

دعوت دورِ تعقل میں

دعوت یا شہادت کا یہ پیغمبرانہ مشن سفر کرتے ہوئے، اب پندرھویں صدی ہجری (اکیسویں صدی عیسوی) میں داخل ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کو دورِ تعقل (age of reason) کہا جاتا ہے۔ اب ضروری ہے کہ جدید ذہن (modern mind) کی نسبت سے اس کو عقلی طور پر مدلل صورت میں پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر مطلوب معیار پر اس کام کی انجام دہی نہیں ہوسکتی۔

شہادتِ اعظم

بعد کے دور میں شہادت کا یہ دعوتی عمل عالمی سطح پر مزید اضافے کے ساتھ انجام پائے گا۔ اس دعوتی واقعے کو حدیث میں شہادت اعظم کہا گیا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دور آئے گا جب کہ شہادت علی الناس یا دعوت الی اللہ کے اس کام کو حجت (reason) کی سطح پر انجام دینا ضروری ہوگا۔ اس وقت امت کے جو افراد وقت کے استدلالی معیار پر اس دعوتی کام کو انجام دیں گے،

وہ اللہ کے یہاں بہت بڑے درجے کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس دور میں اللہ کے جو بندے اس کام کو اس کے مطلوب معیار پر انجام دیں گے، ان کے لیے حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: هذا أعظم الناس شهادةً عند رب العالمين (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938)۔ یعنی یہ اللہ رب العالمین کے نزدیک لوگوں کے اوپر سب سے بڑی شہادت (دعوت) ہوگی۔

شہادت کے تصور میں تبدیلی

اسلام کے ابتدائی دور میں شہادت کا یہی تصور تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ اس زمانے میں شہادت کا لفظ گواہی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جہاں تک اللہ کے راستے میں جان دینے کا معاملہ ہے، اس کے لیے معروف لغوی لفظ قتل استعمال ہوتا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ (2:154)۔ یعنی اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں ان کو مردہ مت کہو۔ اس آیت کے مطابق، اللہ کے راستے میں جان دینے والے کو مقتول فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔

ایسے شخص کا اجر اللہ کے یہاں بلاشبہ بہت بڑا ہے۔ لیکن انسانی زبان میں اس کا ذکر ہوگا تو اس کو مقتول فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔

اس جنگ میں صحابہ میں سے ستر آدمی مارے گیے۔ صحیح البخاری میں اس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: أنس بن مالك أنه قال: قُتِل منهم يوم أُحد سبعون (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4078)۔ یعنی حضرت انس کہتے ہیں کہ احد کے دن اصحابِ رسول میں سے ستر آدمی قتل ہوئے۔

رسول اللہ کے بعد صحابہ اور تابعین کا زمانہ اسلام میں مستند زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہی طریقہ رائج تھا۔ بعد کے زمانے میں دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ جس طرح دوسری تعلیمات میں تبدیلی آئی، اسی طرح شہادت کی اصطلاح میں بھی تبدیلی آئی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے یہ حال ہوا کہ شہادت بمعنی دعوت کا تصور امت کے ذہن سے حذف ہوگیا۔ اس کے بجائے، شہادت اور شہید کا

لفظ جانی قربانی (martyrdom) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

بعد کے زمانے میں یہ رواج عام ہوگیا کہ اس قسم کے افراد کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ شامل کیا جانے لگا۔ مثلاً حسن البنا شہید، سید قطب شہید، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، وغیرہ۔ اصحابِ رسول میں بہت سے لوگوں کے ساتھ جانی قربانی کا یہ واقعہ پیش آیا لیکن کسی کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً عمر بن الخطاب شہید، عثمان بن عفان شہید، علی ابن ابی طالب شہید، سعد بن معاذ شہید، وغیرہ۔ صحابہ کا نام ہمیشہ ان کے آبائی نام کے ساتھ لکھا اور بولا گیا، نہ کہ شہید کے اضافے کے ساتھ۔ جیسا کہ بعد کے زمانے میں رائج ہوا۔ چناں چہ محدث البخاری نے اپنی کتاب میں اس نوعیت کی کچھ روایات کے اوپر یہ باب قائم کیا ہے: باب لا یقول فلان شہید (کتاب الجہاد و السیر)

یہ سادہ بات نہیں ہے بلکہ اسلام کے ایک اہم اصول پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو ان کے آبائی نام کے ساتھ پکارا جائے: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (33:5) یعنی ان کو ان کی آبائی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ نام کے ساتھ شہید یا اس طریقے کے دوسرے الفاظ کا اضافہ کرنا، اشخاص کے بارے میں غیر واقعی ذہن بنانے والا عمل ہے۔ یہ طریقہ اسلامی آداب کے مطابق نہیں۔

شہادت اور شہید کے معاملے میں یہ غیر اسلامی طریقہ موجودہ زمانے میں اپنی آخری حد پر پہنچ گیا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان تشدد کا جو طریقہ رائج ہوا، اس کا اصل سبب یہی ہے۔ جو لوگ اس متشددانہ عمل میں ہلاک ہوتے ہیں، ان کو بطور خود شہید اور شہداء کا ٹائٹل دیا جاتا ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مرنے کے بعد فوراً جنت میں داخل ہوگیے۔

یہ معاملہ اپنی عمومی صورت میں نوآبادیات (colonialism) کے دور میں رائج ہوا۔ اس دور میں مغربی قوموں نے مسلم علاقوں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ اس کے بعد اس دور کے مسلم مقررین اور محررین کی غلط رہنمائی کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر ان کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوگیا۔ یہ ردعمل

پہلے نفرت کی شکل میں جاری ہوا۔ اس کے بعد بتدریج اس نے تشدد کی صورت اختیار کرلی۔

اس متشددانہ عمل کو مقدس بنانے کے لیے کہا گیا کہ جو لوگ اس مقابلے میں مارے جائیں، وہ شہید ہوں گے، اور بلا حساب کتاب فوراً جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ یہ بلاشبہ ایک خود ساختہ مسئلہ تھا، جس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری قوموں کے خلاف اس منفی ردعمل کی آخری تباہ کن صورت وہ ہے جو موجودہ زمانے میں خودکش بمباری (suicide bombing) کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس خودکش بمباری کو مقدس بنانے کے لیے کچھ علماء کی طرف سے غلط طور پر اس کو استشہاد (طلبِ شہادت) کا ٹائٹل دے دیا گیا۔

اب حال یہ ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں شہادت کے نام پر اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ لیکن شہادت کا اصل کام، دعوت الی اللہ کو انجام دینے کی تڑپ کسی کے اندر نہیں، نہ مسلم علماء کے اندر، نہ مسلم عوام کے اندر۔ شہادت کے اس خود ساختہ تصور کے تحت وہ جن لوگوں پر حملے کرتے ہیں، وہ ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مدعو کو ہلاک کرنا اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔

سنتِ یہود کی پیروی

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ امتِ محمدی بعد کے زمانے میں ضرور یہود کی کامل اتباع کرے گی:

لتتبعُنَّ سَنَنَ من کان قبلَکم، شبرًا بشبرٍ وذراعًا بذراع، حتی لو دخلوا جُحْرَ ضبٍّ تبعتُمُوهم. قلنا: یا رسولَ اللہِ، الیہودُ والنصاری؟ قال: فمَنْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7320)۔

یہ سادہ طور پر یہود کی اتباع کا مسئلہ نہیں ہے۔

یہ دراصل ایک قانونِ فطرت کا معاملہ ہے، جس کو قرآن میں طول امد کے نتیجے میں قساوت کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (57:16) یعنی لمبی مدت گزرنے کی بنا پر بعد کی نسلوں میں زوال آنا، اور زوال کی بنا پر ان کے اندر مختلف قسم کے بگاڑ کا پیدا ہوجانا۔

سنتِ یہود کی پیروی کی سب سے زیادہ سنگین صورت وہ ہے جو شہادت (witness) کے معاملے میں واقع ہوئی۔ یہود کو اللہ نے اپنے دین کا گواہ (witness) بنایا تھا۔ اس کا ذکر بائبل میں ان الفاظ میں آیا ہے: خداوند فرماتا ہے تم میرے گواہ ہو، اور میرے خادم بھی جسے میں نے منتخب کیا تاکہ تم جانو اور مجھ پر ایمان لاؤ، اور سمجھو کہ میں وہی ہوں۔ مجھ سے پہلے کوئی خدا نہ ہوا اور میرے بعد بھی کوئی نہ ہوگا (یسعیاہ، 10:43)

You are My witnesses, declares the Lord, and My servant whom I have chosen, so that you may know and believe Me and understand that I am He. Before Me no god was formed, nor will there be one after Me. (Isaiah 43:10)

یہود پر بعد کے زمانے میں جب زوال آیا تو انھوں نے خدا کے دین کی گواہی کی اس ذمے داری کو عملاً چھوڑ دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر ان کے اندر قومی ذہن پیدا ہوگیا۔ ان کے اندر وہ نفسیات پیدا ہوگئی جس کو یہود کی تاریخ میں یہودی احساسِ برتری (Jewish supremacism) کہا جاتا ہے۔

چناں چہ ان کی دلچسپی تمام تر اپنی قوم تک محدود ہوگئی، وہ دوسرے انسانوں کے خیر خواہ نہ رہے۔ بلکہ دوسروں کو عمومی طور پر انھوں نے اپنا دشمن سمجھ لیا۔ کیوں کہ وہ قوم یہود کی خود ساختہ برتری کے نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر انھوں نے دینِ خداوندی کی گواہی کے کام کو چھوڑ دیا، اور اس کے بجائے دوسرے قومی کاموں میں مشغول ہوگیے۔ مگر اسی کے ساتھ خود پسندی (self-righteousness) کے جذبہ کی بنا پر یہ ظاہر کرتے رہے کہ وہ اب بھی اپنے پیغمبر موسیٰ کے بتائے ہوئے دین پر قائم ہیں۔

یہود کے اس معاملے کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا

قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝(3:187-88)-

ترجمہ: جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح لوگوں کے لیے ظاہر کروگے اوراس کونہیں چھپاؤ گے۔مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اوراس کوتھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا۔کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں۔ جولوگ اپنے اس عمل پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جوکام انھوں نے نہیں کئے اس پر ان کی تعریف ہو، ان کو عذاب سے بَری نہ سمجھو۔ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

دورِجدید کے مسلمانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ اس معاملے میں کامل طور پر یہود کے متبع بن چکے ہیں۔انھوں نے دعوت الی اللہ کے کام کو عملاً چھوڑ دیا ہے۔اس کے بجائے وہ دوسرے قومی کام انجام دے رہے ہیں، لیکن ان کاموں کو وہ غلط طور پر دعوت کا کام بتاتے ہیں۔ انھوں نے شہادت کے تصور کو بدل کر جانی قربانی (martyrdom) کے معنی میں لے لیا۔ وہ قومی سیاست (communal politics) میں مشغول ہیں۔ اس خودساختہ عمل میں جب ان کے کچھ لوگ مارے جاتے ہیں تو وہ ان کو بطور خود شہید اور شہداء کا ٹائٹل دے کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ دعوت اور شہادت کا مطلوب کام انجام دے رہے ہیں۔

انسان کوئی کام نفسیاتی محرک کے تحت کرتا ہے۔دعوت الی اللہ کا کام کرنے کے لیے دوسروں کے ساتھ خیرخواہی کی اسپرٹ ضروری ہے۔مگر دورِزوال میں مسلم برتری (Muslim supremacism) کا ذہن جو مسلمانوں میں آیا اس کے نتیجے میں وہ دوسری قوموں کو کم تر اور اپنا حریف سمجھنے لگے۔اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قوموں کے لیے خیرخواہی کا جذبہ ان کے اندر باقی نہ رہا۔موجودہ زمانے کے مسلمان عام طور پر اسی قومی نفسیات کے شکار ہیں۔

یہی سب سے بڑی وجہ ہے، جس نے ان سے دعوت الی اللہ کا جذبہ چھین لیا ہے۔موجودہ زمانے

کے مسلمان بظاہر اپنی سرگرمیوں کو ''نظامِ مصطفیٰ'' کا نام دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا نظامِ مصطفیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ طریقہ عین اسی طریقے کی اتباع ہے جس کو قرآن میں زوال یافتہ یہود کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یعنی یُحِبُّونَ أَنْ یُحْمَدُوا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوا (3:188)۔ قرآن کے یہ الفاظ موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر پوری طرح صادق آرہے ہیں۔ وہ اپنی قومی سرگرمیوں پر دعوت اور شہادت کا ٹائٹل لینا چاہتے ہیں۔ مگر اللہ کے قانون کے مطابق ایسا کبھی ہونے والا نہیں۔ اس قسم کی روش بلاشبہ قابلِ مواخذہ ہے نہ کہ قابلِ انعام۔

خودکش حملہ

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندران کی زوال یافتہ قومی نفسیات کے تحت ایک ایسا ظاہرہ پیدا ہوا ہے جو غالباً تحلیلِ حرام (یسمّونها بغیر اسمها فیستحلونها: سنن الدارمی، حدیث نمبر 2145) کی سنگین ترین صورت ہے، اور وہ ہے خودکش بمباری (suicide bombing)۔ یعنی مفروضہ دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے اپنے آپ کو بم سے اڑا دینا۔

یہ طریقہ بلاشبہ نصِ شرعی کے مطابق ایک حرام فعل ہے۔ کچھ علماء نے بطورِ خود، خودکش بمباری کے اس فعل کو استشہاد (طلبِ شہادت) کہہ کر جائز قرار دیا ہے۔ مگر اس قسم کا استدلال گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اس قسم کا کوئی بھی خود ساختہ فتویٰ خودکش بمباری جیسے صراحتاً ناجائز فعل کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔

ایک حدیث اس معاملے میں قطعی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے، مثلاً صحیح البخاری (حدیث نمبر 3062)، صحیح مسلم (حدیث نمبر 112)، مسند امام احمد (حدیث نمبر 8090)، وغیرہ۔ ان مختلف روایتوں کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں۔ روایت کے مطابق، صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے۔

ہمارے ساتھ ایک شخص تھا جو ایمان لا چکا تھا۔ اس کا نام قزمان تھا۔ جنگ ہوئی تو یہ شخص شدید طور پر لڑا۔ لوگ اس کی بہادری کی تعریف کرنے لگے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں کہا کہ وہ اہل جہنم میں سے ہے (إنّه من أهل النّارِ)۔ لوگوں کو آپ کے اس قول پر یقین نہیں ہوا۔ آپ نے کہا کہ جا کر اس کی تحقیق کرو۔ جب لوگوں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جنگ میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا تھا۔ پھر زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے اپنے آپ کو خود اپنے ہتھیار سے ہلاک کر لیا (فقَتل نفْسه)۔ اس کے بعد آپ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں خودکشی مطلق حرام کی حیثیت رکھتی ہے۔ حتی کہ کوئی شخص بظاہر پیغمبر کا ساتھی ہو، اور وہ غزوہ میں لڑ کر بہادری دکھائے لیکن آخر میں وہ اپنے آپ کو خود اپنے ہتھیار سے مار کر اپنا خاتمہ کر لے تب بھی اس خودکشی کی بنا پر اس کی موت، حرام موت قرار پائے گی۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگر مسلمانوں پر حملہ کیا جائے، اور وہ لڑتے ہوئے مارے جائیں تو یہ جائز ہے۔ لیکن قصداً اپنے جسم کے ساتھ بم باندھنا، اور مفروضہ دشمنوں کے درمیان جا کر بم کا دھماکا کر دینا، جس میں وہ آدمی خود بھی مرے، اور دوسرے بھی مارے جائیں۔ یہ طریقہ صراحتاً خودکشی کا طریقہ ہے، اور وہ یقینی طور پر اسلام میں ناجائز ہے۔ اہل ایمان کے لیے حملے کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ مقابلہ کرنے کی حیثیت میں نہ ہوں تو اس کے بعد ان کے لیے کرنے کا جو کام ہے، وہ صبر ہے، نہ کہ خودکش حملہ۔ مگر اس معاملے میں موجودہ مسلمانوں کا آبسیشن (obsession) اتنا بڑھا ہوا ہے کہ کوئی اس پر سوچنے کے لیے تیار نہیں۔

بے فائدہ جنگ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذي نفسي بيده لا تذهب الدنيا، حتى يأتي على الناس يوم لا يدري القاتل فيم قَتَل، ولا المقتول فيم قُتِل۔ فقيل: كيف يكون ذلك؟ قال:

الهرج، القاتل والمقتول في النار (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2908)۔ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، دنیا ختم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا، جب کہ قاتل یہ نہیں جانے گا کہ اس نے کیوں قتل کیا، اور مقتول یہ نہیں جانے گا کہ اس کو کیوں قتل کیا گیا۔ کہا گیا کہ ایسا کیوں کر ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا ہرج (بے معنی قتل وقتال) کے زمانے میں ہوگا۔ قاتل اور مقتول دونوں آگ میں جائیں گے۔

ہرج کا مطلب شارحین حدیث نے بتایا ہے: شدة القتل و کثرته (عمدة القاری، جلد نمبر 7، صفحہ نمبر 58)۔ یعنی قتل وقتال کی شدت اور کثرت۔ اس قسم کے مجنونانہ قتل وقتال کی صورت کسی گروہ میں کب پیش آتی ہے۔ جب وہ گروہ قوم پرستی میں دوسروں کے خلاف اندھی دشمنی تک پہنچ جائے۔ یہی موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا حال ہے۔ ان کے اندر آخری حد تک یہ ذہن پیدا ہوگیا ہے کہ انھوں نے قومی حمایت میں دوسروں کو اپنا ابدی دشمن سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دوسری قومیں ان کے خلاف ہر وقت سازش میں مصروف رہتی ہیں۔ اس خود ساختہ سوچ کی بنا پر دوسری قوموں کے خلاف ان کے دل میں جنون کی حد تک نفرت اور تشدد کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر تشدد (violence) کا جو انتہا پسندانہ ظاہرہ دکھائی دیتا ہے، وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ وہ نہ صرف دوسری قوموں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہوگئے ہیں، بلکہ خود ان مسلمانوں کے خلاف بھی، جن کے بارے میں وہ یہ فرض کرلیں کہ وہ ان کے دشمنوں کے حامی ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ حال ہے کہ مسلمانوں کے مختلف ٹیررسٹ (terrorist) گروپ بن گیے ہیں۔ وہ مختلف مقامات پر قتل وقتال کا ہنگامہ جاری کیے ہوئے ہیں، حتی کہ اسکول کے بچوں، مسجد کے نمازیوں، اور قبرستان کے سوگوار افراد پر بھی۔ قتل وقتال کا یہ اَن جسٹیفائڈ (unjustified) ہنگامہ اتنا زیادہ ہے، جیسے کہ ان لوگوں نے قتال برائے قتال کو خود ایک مطلوب کام سمجھ لیا ہے۔ خواہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی معقول سبب (justified reason) موجود نہ ہو۔

مسئلہ کا حل

امتِ مسلمہ کے اندر یہ جو سخت نامحمود صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، اس کا حل صرف یہ ہے کہ ان کو صحیح آئڈیالوجی دی جائے۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں غلط آئڈیالوجی کے شکار ہیں۔ اس کی اصلاح صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کو قرآن وحدیث کی بنیاد پر درست آئڈیالوجی سے واقف کرایا جائے۔ اس سے کم درجے کی کوئی چیز اس صورتِ حال کی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

مثلاً ان لوگوں کو اس فطری حقیقت سے باخبر کرنا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ○ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ○ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ (41:34-36)۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے۔ اور اگر شیطان تمھارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسانوں کے درمیان جو تفریق ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ ہمارے دوست ہیں اور کچھ لوگ ہمارے دشمن۔ بلکہ صحیح تفریق یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمارے واقعی دوست (actual friends) ہیں، اور کچھ لوگ ہمارے امکانی دوست (potential friends)۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔

اس کے مطابق اہل ایمان کو یہ کرنا ہے کہ وہ کسی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھیں، بلکہ بلا تفریق ہر ایک کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کریں — یہی دعوہ اسپرٹ ہے، اور اسی کا نام دعوت الی اللہ ہے۔

اسی طرح ان لوگوں کو قرآن کی وہ آیت یاددلانا ہے، جس میں قتل کی برائی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (5:32)۔ جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کرڈالا اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو بچالیا۔

اسی طرح ان لوگوں کو یہ بتانا کہ مسلمان کا مسلمان کو مارنا قرآن کے مطابق ایک جہنمی فعل ہے۔ اس سلسلے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (4:93)۔ اور جو شخص کسی مومن کو جان کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

پیغمبرِ اسلام کی آخری وصیت

آج شدید ضرورت ہے کہ پیغمبر اسلام کے اس انتباہ کو تمام دنیا کے مسلمانوں کو یاددلایا جائے جو آپ نے اپنے آخری زمانے میں حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا۔ صحیح البخاری کی روایت کے مطابق اس کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خطب الناس يوم النحر فقال: يا أيها الناس أي يوم هذا؟، قالوا: يوم حرام، قال: فأي بلد هذا؟، قالوا: بلد حرام، قال: فأي شهر هذا؟، قالوا: شهر حرام، قال: فإن دماءكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في بلدكم هذا، في شهركم هذا، فأعادها مرارا، ثم رفع رأسه فقال: اللهم هل بلغت، اللهم هل بلغت - قال ابن عباس رضي الله عنهما: فوالذي نفسي بيده، إنها لوصيته إلى أمته، فليبلغ الشاهد الغائب، لا ترجعوا بعدي كفارا، يضرب بعضكم رقاب بعض (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1739)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ آپ نے کہا کہ اے لوگو، آج کون سا دن ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ یومِ حرام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ شہر حرام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کون سا مہینہ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ حرام کا مہینہ ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ سن لو کہ تمھارا خون، تمھارے مال، اور تمھاری عزت تمھارے اوپر حرام ہے، جیسا کہ آج کا دن حرام کا دن ہے، اور تمھارے اس شہر میں، اور تمھارے اس مہینے میں۔ آپ نے یہ کلمات بار بار فرمائے۔ پھر آپ نے سر اٹھایا، اور فرمایا کہ اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا، اے اللہ، کیا میں نے پہنچا دیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک یہ آپ کی وصیت ہے اپنی امت کے لیے، پس جو حاضر ہے وہ ان کو پہنچا دے جو حاضر نہیں ہے، (پھر ابن عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ذکر کیا) تم لوگ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو۔

امت کے لیے کرنے کا کام

موجودہ زمانے میں امت مسلمہ عام طور پر منفی ذہن میں مبتلا ہوگئی ہے۔ یہ صرف ان کی زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر ہے۔ اپنی منفی سوچ کے تحت وہ دوسری قوموں کو اپنے دشمن کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ کچھ لوگوں کے اندر یہ مزاج سوچ کی حد تک ہے، اور کچھ لوگ اپنی اس سوچ کے تحت قتل وقتال میں مشغول ہیں۔ یہ بلاشبہ وہی خطرناک علامت ہے، جس کی طرف احادیث میں پیشگی طور پر باخبر کیا گیا تھا۔

آج فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے افراد اپنے اندر مثبت ذہن (positive thinking) پیدا کریں۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن سمجھنے کا مزاج کلی طور پر ختم کردیں۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو یہ حقیقت یاد دلائی جائے کہ ان کی حیثیت ایک قوم کی نہیں ہے، بلکہ ایک اصولی گروہ کی ہے۔ ان کا مشن صرف ایک ہے، اور وہ پرامن دعوت الی اللہ ہے۔ اس کام کو

انھیں یک طرفہ خیر خواہی کے تحت انجام دینا ہے۔ اگر دوسرے لوگ ان کے خیال کے مطابق ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کریں تب بھی انھیں اس قسم کی چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر لوگوں کا خیر خواہ بننا ہے، اور ان کو اللہ کا وہ پیغام پہنچانا ہے جو ان کے پاس قرآن وسنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا عمل ان کو آخرت کی پکڑ سے بچانے والا نہیں۔

اسلام کے نام پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے درمیان جو متشددانہ سرگرمیاں جاری ہوئیں، ان پر اب ایک صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ لیکن ان کی یہ سرگرمیاں ہر محاذ پر نتیجے کے اعتبار سے ناکام ہوگئیں۔ وہ مسلمانوں کے حق میں کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter-productive) ثابت ہوئیں۔ ان متشددانہ سرگرمیوں کا یہ منفی انجام بتاتا ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کو اللہ کی مدد حاصل نہیں۔ اگر اس معاملے میں ان کو اللہ کی مدد ملتی تو وہ ضرور کامیاب ہوتے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی سرگرمیوں پر نظر ثانی کریں۔ وہ تشدد کا طریقہ یک لخت چھوڑ دیں، اور پر امن دعوتی عمل (peaceful dawah work) میں مصروف ہوجائیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جو مسلمانوں کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنا سکتا ہے۔ (یہ مضمون کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے)

قرآن کتابِ تدبر

قرآن کی سورہ ص کی ایک آیت یہ ہے: كِتَٰبٌ أَنزَلۡنَٰهُ إِلَيۡكَ مُبَٰرَكٞ لِّيَدَّبَّرُوٓاْ ءَايَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ.(38:29) یعنی یہ ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی باتوں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو قرآن کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کرے۔ صرف لفظی تلاوت کے ذریعہ قرآن کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ مزید یہ کہ تدبر کے لیے تیار ذہن (prepared mind) درکار ہے۔

جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک تیار ذہن بنائے۔ اس کے بعد ہی وہ قرآن کو حقیقی طور پر سمجھ سکے گا۔ اپنے آپ کو تیار ذہن بنانے کے لیے جو شرطیں درکار ہیں، ان میں سے ایک ضروری شرط تقویٰ (2:282) ہے۔ متقی انسان ایک سنجیدہ (sincere) انسان ہوتا ہے۔ سنجیدگی کے بغیر کوئی شخص قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

قرآن میں عقل کے مترادف کم سے کم چھ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں — عقل، فؤاد، لب، قلب، حجر، نُہیٰ۔ ان کے سوا قرآن میں اور بہت سے الفاظ ہیں، جو بالواسطہ طور پر عقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً سمع اور بصر وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تمام آیتیں عقل پر مبنی ہیں، کچھ آیتیں براہِ راست طور پر اور کچھ آیتیں بالواسطہ طور پر۔

مثلاً إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ (13:19) اور إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَٰتٖ لِّأُوْلِي ٱلنُّهَىٰ. (20:54) جیسی آیتوں میں براہِ راست طور پر عقل کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس طرح کی آیتیں قرآن میں کثرت سے ہیں۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ اگر تم قرآن کو یا قرآن کے پیغام سمجھنا چاہتے ہو تو اپنی عقل (reason) کو استعمال کرو۔ عقل کے استعمال کے بغیر تم قرآنی آیتوں کے حقیقی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتے۔

جہاں تک عقل کے بالواسطہ حوالے کی بات ہے، اس سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مثلاً قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1:1)۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اس اللہ کی حمد کرو جو سارے عالم کا رب (Lord) ہے۔ اس سے واضح ہے کہ کوئی شخص اللہ کی حقیقی حمد، اسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ اس نے اللہ کو رب العالمین کی حیثیت سے دریافت کیا ہو۔ اس قسم کی دریافت کسی آدمی کو صرف عقل کے استعمال کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔

اسی طرح قرآن کی آخری سورہ یہ ہے کہ انسان اور جن کے وسوسہ کے شر سے اپنے آپ کو بچاؤ (الناس)۔ یہاں ظاہر ہے کہ وسوسہ ایک غیر محسوس چیز ہے۔ وسوسہ کو چھوکر یا دیکھ کر نہیں جانا جاسکتا، وسوسہ کے شر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے عقل کو استعمال کرکے وسوسہ کو دریافت کرے۔ اِس طرح قرآن کی یہ آیت عقل کے بالواسطہ حوالے کی ایک مثال ہے۔

یہی معاملہ قرآن کی تمام آیتوں کا ہے۔ مثلاً قرآن میں مومن کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں (2:3)۔ غیب پر ایمان صرف اس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے، جو غیبی حقیقتوں کو یقین کے درجے میں دریافت کرے، اور یہ بات صرف عقلی غور وفکر کے ذریعہ ممکن ہے۔ اسی طرح، مثلاً قرآن میں حج کے حکم کے ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ (2:197)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حج تو ایک عبادت کا فعل ہے، اس کا جدال سے کیا تعلق۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کی عبادت کے دوران بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ساتھ رہنے کی بنا پر فطری طور پر آپس میں اختلافات (differences) پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے حاجی کو چاہئے کہ وہ اختلاف پر صبر کرے، وہ اس کو جدال تک پہنچنے نہ دے۔ آیت کا یہ پہلو بھی عقل کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن کی ایک سورہ میں معاہدۂ حدیبیہ کا صراحتاً ذکر کیے بغیر یہ آیت آئی ہے: اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا (48:1)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ میں تو فریقِ ثانی

سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر کے رسول اور اصحاب رسول مدینہ واپس آ گئے تھے، پھر اس کا فتح مبین سے کیا تعلق۔ آیت کا یہ گہرا مفہوم صرف اس وقت معلوم ہوتا ہے، جب کہ آدمی آیت پر تاریخ کی روشنی میں غور وتدبر کرے، اور یہ عقل کے استعمال کے بغیر نہیں ہوسکتا، وغیرہ۔

قرآن میں کل ایک سو چودہ (114) سورتیں ہیں۔ اگر ان تمام سورتوں کو پڑھا جائے تو ان میں کہیں بھی قانون کی زبان نہیں ملے گی، بلکہ دعوت اور تذکیر کی زبان ملے گی، اور دعوت اور تذکیر کے معاملے کو درست طور پر صرف اس وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو عقل کا استعمال کر کے جاننے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو کہنا صحیح ہوگا کہ قرآن معروف معنوں میں کوئی فقہی کتاب یا قانون کتاب نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں بھی وہ اسلوب استعمال نہیں کیا گیا ہے جو فقہ کی کتابوں یا قانونی کی کتابوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآن وزڈم کی کتاب (book of wisdom) ہے۔

سی پی ایس ٹیم (ممبئی) 14-15 اگست کوناگپور کا دورہ کرے گی تا کہ زیادہ سے زیادہ قارئین الرسالہ کو سی پی ایس کے دعوتی مشن سے جوڑا جا سکے۔ رابطہ قائم فرمائیں:

Mr. Mehboob Honnutagi: 9619163993
Mr. Sajid Anwar: 9967044976
Dr. Junaid Shaikh: 9967480701

مالیگاؤں (مہاراشٹر) میں الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Mr. Usman
Goodword Books (Distributor)
71/1, Plot No. 11, Ansar Colony, Near Maharashtra Sizing,
Malegaon, Dist. Nashik, Maharashtra -423203, Mob. 08983759678

نوٹ: ہر جمعہ کو مذکورہ مقام پر بعد مغرب الرسالہ مشن کے ممبران کی میٹنگ بھی ہوتی ہے۔

گلوبل کمیونی کیشن کا دَور

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے چار ہزار سال پہلے جب کعبہ کی تعمیر کی تو اللہ تعالی نے یہ حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تمھارے پاس آئیں گے پیروں پر چل کر اور دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر جو کہ دور دراز راستوں سے آئیں گے (22:27) اس سلسلے میں ایک روایت آئی ہے۔ اس کے مطابق حضرت ابراہیم نے کہا کہ یا رب کیف أبلّغ الناس وصوتي لا ینفذهم فقال نادِ وعلینا البلاغ (تفسیر ابن کثیر: 3/216) یعنی اے میرے رب، میں اپنی آواز لوگوں تک کیسے پہنچاؤں گا، اور میری آواز ان تک پہنچنے والی نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم پکارو، پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔

کعبہ کی تعمیر مکمل کرنے کے بعد حضرت ابراہیم نے آواز دی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی آواز باہر کے لوگوں تک نہیں پہنچی۔ پھر اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ بات حال کی خبر کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ مستقبل کے امکان کے معنی میں ہے۔ اس روایت میں دراصل اللہ کے ایک منصوبے (divine plan) کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابراہیم اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انسانی تاریخ میں ایک عمل (process) جاری ہوگا۔ اس عمل کی تکمیل پر یہ واقعہ ہوگا کہ اللہ کا ایک بندہ مکہ میں یا کسی دوسرے مقام پر اللہ کی بات کہے گا اور اس کی بات بطور واقعہ ہر جگہ پہنچ جائے گی۔ یہ دور تاریخ میں آیا۔ اسی دور کو ابلاغ کا دور (age of communication) کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالی کی خصوصی مدد سے، ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجے میں انسان نے نئی نئی دریافتیں کیں اور آخر کار وہ دور وجود میں آ گیا جس کو کمیونیکیشن کا دور کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں صرف یہ ممکن ہوتا تھا کہ انسان اپنی زبان سے بولے اور اس کے قریب میں جو لوگ ہیں، اس کی آواز کو سنیں، لیکن اب ٹیکنالوجی کے ذریعہ یہ ممکن ہوگیا ہے کہ انسان ایک مقام پر بولے اور عین اسی وقت پورے گلوب پر بسے ہوئے لوگ اس کی آواز بھی سنیں اور اس کی تصویر بھی دیکھیں۔ یہ نیا دور اللہ کی توفیق سے وجود میں آیا اور اس کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس کو خدائی مشن کے لیے استعمال کیا جائے۔

قرآن کی حفاظت

قرآن کی کچھ آیتیں وہ ہیں جن کو احکام کی آیتیں کہا جاتا ہے۔قرآن کی آیتوں کا دوسرا حصہ وہ ہے، جن کو حکمت (wisdom) کی آیات کہنا درست ہوگا۔ یہ حکمت کسی پراسرار چیز کا نام نہیں ہے۔ اس سے مراد فطری حکمت (natural wisdom) ہے، یعنی حکمت کے وہ اصول جن پر دنیا کا نظام قائم ہے، اور جن کی پیروی کر کے کوئی انسان، اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کرسکتا ہے۔

قرآن واحد محفوظ الہامی کتاب ہے۔اس حقیقت کا اظہار قرآن میں پیشگی طور پر ان الفاظ میں کیا گیا تھا: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) یعنی یہ یاددہانی (کتاب) ہم نے اتاری ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی حفاظت کا یہ کام ثابت شدہ تاریخ کے مطابق چار ادوار (periods) میں انجام پایا۔ پہلے دور میں یہ کام زیادہ تر حفظ (memorization) کے ذریعہ ہوا۔ دوسرے دور میں حفاظتِ قرآن کا یہ کام تحریر (writing) کے ذریعہ انجام پایا۔لوگوں نے بڑی تعداد میں یہ کیا کہ حفظ قرآن کے ساتھ وہ جزئی یا کلی طور پر قرآن لکھتے رہے۔ کتابت کا یہ کام قدیم زمانے کی دستیاب چیزوں پر ہوتا رہا جن میں قدیم طرز کا کاغذ (قرطاس) بھی شامل ہے۔ اس کے بعد پرنٹنگ پریس کا زمانہ آیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس ساری دنیا میں عام ہوگیا۔اس کے بعد قرآن مطابع میں چھاپا جانے لگا۔اس کے مجلد نسخے بڑی تعداد میں تیار کیے گئے۔ یہ مطبوعہ نسخے ہر جگہ پھیل گئے۔ اس کے بعد ٹکنالوجی کا زمانہ آیا، اور اب انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون پر پورا قرآن، تحریر اور آواز دونوں صورتوں میں محفوظ ہو چکا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب قرآن اترا، اس وقت پورے ملک عرب کی زبان عربی تھی۔ لیکن دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان کا بھی یہ حال تھا کہ مختلف علاقوں کے عرب قبیلے مختلف لہجے

میں عربی بولتے تھے۔ اس بنا پر ایسا ہوا کہ اسلام جب پورے عرب میں پھیل گیا تو ہر ایک کا قرآن باعتبار متن ایک ہی قرآن تھا، لیکن قرآن کو پڑھنے کا لہجہ سب کا ایک نہ تھا۔ اس وقت لوگوں کی سہولت کے لیے یہ کہا گیا کہ قرآن سات لہجوں میں اترا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ باعتبار نزول قرآن کے سات لہجے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے اپنے لہجے کے اعتبار سے قرآن کے پڑھنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں، یہ ایک عملی بات تھی نہ کہ کوئی نظری بات۔

قرآن کے متن (text) کی حفاظت کے لیے صحابہ نے آخری انتہائی طریقہ اختیار کیا۔ مثلاً خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے حکم سے زید بن ثابت انصاری نے قرآن کو کاغذ پر لکھ کر اس کا مصحف تیار کیا جس کو رَبعہ کہا جاتا تھا۔ یہ کام انھوں نے ڈبل چیکنگ سسٹم (double checking system) کے اصول پر کیا، یعنی لکھے ہوئے کو حفظ سے چیک کرنا، اور حفظ کو لکھے ہوئے سے چیک کرنا۔ اس طرح جو کاغذی نسخہ (ربعہ) تیار ہوا اس کو خلیفہ اول کے حکم سے رسول اللہ کی زوجہ حفصہ کے گھر پر رکھ دیا گیا۔

ایک مصحف (رَبعہ) کی صورت میں لکھے جانے سے پہلے لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا مختلف چیزوں پر لکھے ہوئے موجود تھے۔ مستند مصحف تیار ہونے کے بعد خلیفہ اول کے حکم سے اور تمام صحابہ کی رائے سے یہ کیا گیا کہ ان تمام مختلف اجزا کو جلا دیا گیا۔ حرق مصحف کا یہی واقعہ دوسری بار خلیفہ ثالث حضرت عثمان کے زمانہ میں پیش آیا۔ اس مدت میں لوگوں نے بطور خود جزئی یا کلی طور پر مصاحف لکھ لیے تھے۔

ان مصاحف میں ان کے قبائل کی قرأت کا اسلوب شامل ہو گیا تھا۔ حضرت عثمان نے یہ کیا کہ زید بن ثابت انصاری کی قیادت میں صحابہ کی ایک کمیٹی بنائی۔ پھر انھوں نے حضرت حفصہ کے پاس جو مصحف صدیقی محفوظ تھا اس کو منگوایا، اور صحابہ سے کہا کہ اس کی نقلیں تیار کرو۔ اس طرح مصحف صدیقی کی سات نقلیں تیار کی گئیں۔ پھر خلیفہ کے حکم سے ان نقلوں کو مدینہ اور دوسرے شہروں کی مسجدوں میں رکھوا دیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان نے مزید اہتمام یہ کیا کہ لوگوں نے بطور خود قرآن

کے جو تحریری نسخے تیار کیے تھے، ان کو جمع کروایا اور پھر صحابہ کے اتفاق رائے سے ان تمام مصاحف کو جلا دیا گیا- یہ کام بہت جرأت کا طالب تھا-

لیکن حضرت عثمان نے صحابہ کی رائے سے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا- بعد کو جب خلیفہ ثالث کے خلاف کچھ شورش پسندوں نے ہنگامہ کیا، یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا گیا، اس وقت شورش پسندوں نے خلیفہ ثالث کو بدنام کرنے کے لیے جو باتیں کہی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے خلیفہ ثالث کو حرّاق المصاحف قرار دیا تھا، یعنی قرآن کو جلانے والا- (الجامع لأحکام القرآن للقرطبي، خطبة الکتاب، ص:54)

قرآن کی تاریخ اور اس کی تدوین پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں- یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن اگرچہ قدیم زمانہ میں اترا، لیکن اس کی حفاظت کے لیے تمام ممکن اقدام کیا گیا، حتی کہ سیکولر محققین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے-

---

امت کا زوال

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ سنن ابی داؤد کے الفاظ یہ ہیں: إنَّ أوّلَ ما دخلَ النّقصُ علَى بَني إسرائيلَ كانَ الرّجلُ يَلقى الرّجلَ فيقولُ ياهذا اتّقِ اللّهَ ودَع ماتصنَعُ فإنّهُ لايحلُّ لَكَ ثمّ يَلقاهُ منَ الغَدِ فلا يمنعُهُ ذلِكَ أن يَكونَ أكيلَهُ وشريبَهُ وقعيدَهُ فلمّا فعلوا ذلِكَ ضربَ اللّهُ قلوبَ بعضِهِم ببعضٍ ثمّ قالَ لُعِنَ الّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ إلى قولِهِ فَاسِقُونَ ثمّ قالَ كلّا واللّهِ لتأمُرُنَّ بالمعروفِ ولتَنهَوُنَّ عنِ المنكَرِ ولتأخُذُنَّ علَى يدَيِ الظّالمِ ولتأطُرُنّهُ علَى الحقِّ أطرًا ولتقصرُنّهُ علَى الحقِّ قصرًا (ابوداؤد:4336)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کے اندر جو پہلا نقص آیا، وہ یہ تھا کہ ان کا ایک شخص اپنی قوم کے دوسرے شخص سے ملتا اور اُس سے کہتا کہ اے شخص، خدا سے ڈر اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں۔ پھر وہ اگلے دن اُس شخص سے ملتا (اور وہ دیکھتا کہ وہ اپنی روش سے باز نہیں آیا ہے)۔ مگر یہ چیز اُس کو اِس سے نہ روکتی کہ وہ اس کے ساتھ کھانے اور پینے اور بیٹھنے میں اس کا شریک بنے۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو اللہ نے ایک کے دل کو دوسرے کے دل جیسا کر دیا۔ پھر آپ نے سورہ المائدۃ (سورہ نمبر 5) کی آیت 78 تا 81 پڑھی۔ پھر آپ نے فرمایا: خدا کی قسم، تم ضرور لوگوں کو معروف کا حکم دو گے، اور تم ضرور لوگوں کو منکر سے روکو گے، اور تم ضرور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور تم اس کو ضرور حق کی طرف موڑ دو گے۔

یہ حدیث اصلاً یہود کی شکایت کے طور پر نہیں ہے، بلکہ وہ امت مسلمہ کی نصیحت کے طور پر ہے۔ اس حدیث میں امتوں کے بارے میں ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے، اور وہ یہ کہ جب امت کی بعد کی نسلوں میں زوال آتا ہے تو ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی زوال کے ظاہرے کی نشاندہی فرمائی ہے، اور امت کے رہنماؤں کو بتایا ہے کہ اس وقت انھیں کیا کرنا چاہئے۔ غور کیجئے تو یہ حدیث مسلمانوں کے آج کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔

نسخ کیا ہے

قرآن کی سورہ البقرۃ کی ایک آیت یہ ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2:106) یعنی ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں نسخ سے مراد الغاء (to abolish) نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ہٹانا (replacement) ہے۔ آیت میں اس عمل کو بظاہر اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن یہ اسلوب کی بات ہے۔ اس سے مراد حقیقتاً اجتہاد کا عمل ہے، جس کو متقی اہل علم انجام دیتے ہیں۔ خیر سے مراد اچھا (better) نہیں ہے بلکہ اس سے مراد انسانی حالات کے اعتبار سے زیادہ قابلِ تطبیق (more applicable) ہونا ہے۔

قرآن کے مطابق، اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (33:23)۔ مگر انسان ایک آزاد مخلوق ہے، اس بنا پر انسان کے حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ حالات کی اس تبدیلی کی بنا پر ضرورت ہوتی ہے کہ اللہ کے کسی حکم کو مطابقِ حالات بنانے کے لیے اس کو ری ڈیفائن (redefine) کیا جائے یا حالات کے مطابق اس کی نئی تفسیر (re-interpretation) کیا جائے۔ یہی وہ فطری ضرورت ہے جس کو قرآن کی اس آیت میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کی کچھ آیتوں میں اہل ایمان کو قتال (war) کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم توحید کی طرح ابدی حکم کے معنی میں نہ تھا، بلکہ حالات کی نسبت سے مطلوب تھا۔ اب حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ قدیم دور اگر جنگ کا دور تھا تو اب دنیا میں امن کا دور آچکا ہے، اب اسلام کے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے جنگ کی ضرورت نہیں۔ اس لیے اب قتال کی آیت کی تشریح نو (re-interpretation) کی جائے گی، اور یہ نئی تشریح بلاشبہہ قرآن کے مطابق قرار پائے گی۔

عورت اور مرد کا تعلق

جدید دور میں ایک نظریہ بہت زیادہ عام ہے، وہ ہے صنفی مساوات (gender equality) کا نظریہ۔ اس نظریہ کو دور جدید کی بہت بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ نظریہ ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ پیدائشی طور پر ہر عورت مس ڈِفرنٹ (Ms. Different) ہے، اور ہر مرد مسٹر ڈِفرنٹ (Mr. Different)۔

عورت اور مرد کے درمیان یہ فرق ایک گہری حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے اعتبار سے ایک دوسرے کے مشیر (adviser) بنیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے نظام کے مطابق صنفی حصے داری (gender partnership) کا نظریہ زیادہ درست نظریہ ہے، نہ کہ صنفی برابری کا نظریہ۔ انسان کی زندگی مسائل (problems) کا مجموعہ ہے۔ یہ مسائل ہمیشہ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے بار بار یہ ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی کے دو ساتھیوں میں دو مختلف صفات ہوں تاکہ ہر مسئلہ کو مینج (manage) کیا جاسکے۔ ہر ایک اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مسائل حیات کے حل میں اپنا اپنا حصہ ادا کرسکے۔ ایک شریک حیات ایک اعتبار سے اپنا حصہ ادا کرے، اور دوسرا شریک حیات دوسرے اعتبار سے:

There must be a partner who can deal with the problem differently.

فطرت کے نظام میں یکسانیت (uniformity) موجود نہیں، اس لیے اگر عورت اور مرد کے تعلق کو یکسانیت کے اصول پر قائم کیا جائے تو ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہے گا۔ ہر ایک ذمے داری کو دوسرے فریق کے اوپر ڈالے گا، اور پھر نزاع کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے برعکس، صنفی حصے داری کے اصول کو اختیار کرنے کی وجہ سے بلا اعلان تقسیم کار (division of labour) کا طریقہ رائج ہوجائے گا۔ دونوں خود اپنے فطری تقاضے (natural urge) کے تحت اپنے اپنے دائرے میں مصروف کار رہیں گے۔ ایک دوسرے سے الجھنے کا طریقہ ختم ہوجائے گا۔ اور ایک دوسرے سے معاونت کا طریقہ رائج ہوجائے گا۔

دفاع یا دعوت

سر ولیم میور(William Muir) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز تھا، جو برٹش حکومت کے دور میں غیر منقسم ہندستان کی ایک ریاست کا گورنر مقرر رہا۔ سر ولیم میور نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام ’’لائف آف محمد‘‘(*The Life of Mahomet*) تھا۔ یہ انگریزی کتاب 1866 میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

علماء کے نزدیک یہ کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ’’زہر‘‘ پھیلانے والی کتاب تھی۔ لوگ مصنف کو دشمن اسلام قرار دے کر اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ سر سید احمد خاں کو اس پر غصہ آیا، انھوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کروایا، پھر اس کے خلاف اردو زبان میں ایک کتاب لکھی، جو خطبات احمدیہ کے نام سے شائع ہوئی۔

اس طرح کے کام کو دفاع اسلام کا عنوان دے کر بہت اہم کام سمجھا جاتا ہے، مگر یہ طریقہ سنت کے مطابق نہیں۔ سنتِ رسول کے مطابق اصل کرنے کا کام دعوت اسلام ہے، نہ کہ دفاع اسلام۔ یعنی مصنف کے لئے دعا کرنا، اس سے مل کر اس کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔ اس موضوع پر مثبت انداز میں تعارفی کتاب تیار کر کے چھاپنا۔ انگریزوں میں اور دوسرے لوگوں میں پرامن دعوتی مشن جاری کرنا۔ سنت رسول کے مطابق یہی کرنے کا اصل کام ہے۔ مگر یہ اصل کام نہ سر سید احمد خاں نے کیا، اور نہ علماء نے۔

سنتِ رسول کے مطابق اسلام کا اصل مشن یہ نہیں ہے کہ مفروضہ دشمنان اسلام کے خلاف مناظرانہ انداز میں تقریریں کی جائیں، جوابی انداز میں کتابیں شائع کی جائیں، یہ سب ردعمل (reaction) کے طریقے ہیں، اور ردعمل اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ اس قسم کے حامیان اسلام کو نتیجہ (result) کے اعتبار سے غور کرنا چاہئے، یعنی انھیں یہ جائزہ لینا چاہئے کہ ان کی جوابی کوششوں کا مثبت نتیجہ کیا ہوا، باعتبار نتیجہ اس سے اسلام کو فروغ ہوا یا نفرت کو فروغ ہوا۔

قرآن وسنت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ آخر کی ایک حدیث ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة نبيه (مؤطا امام مالك: 1874) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے، جب تک تم ان دونوں چیزوں کو پکڑے رہو گے، وہ دو چیزیں ہیں: اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ یہ حدیث اس معیار (criterion) کو بتاتی ہے جس کی روشنی میں بعد کے زمانے کے مسلمانوں کو جانچ کر یہ معلوم کیا جاسکے کہ وہ صراط مستقیم پر قائم ہیں یا وہ اس سے ہٹ گئے ہیں۔ اس معاملے کا یہی واحد معیار ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا معیار اس معاملے میں درست نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے درمیان پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) قرآن وسنت ہو تو وہ ہدایت پر ہیں، اور جب ان کے درمیان پوائنٹ آف ریفرنس کچھ اور ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہدایت پر قائم نہیں۔

جب مسلمانوں کی کتابیں قرآن وسنت پر مبنی ہوں، جب ان کی مجلسوں میں قرآن وسنت کا چرچا ہو، جب وہ ہر معاملے میں قرآن وسنت سے رہنمائی لیتے ہوں، جب ان کا یہ حال ہو کہ وہ قرآن وسنت کے نام پر بولیں اور قرآن وسنت کے نام پر چپ ہو جائیں، تب سمجھنا چاہئے کہ وہ ہدایت پر ہیں اور جب ایسا نہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہدایت سے بھٹک گیے ہیں۔ تاہم قرآن وسنت سے ہٹنے کی ایک اور صورت ہے، جو قرآن وسنت کا نام لینے کے باوجود باقی رہتی ہے، اور یہ وہی ہے جس کو حدیث میں تفسیر بالرائے کہا گیا ہے۔ تفسیر بالرائے کا مطلب ہے قرآن وسنت کی غلط تعبیر (misinterpretation)۔ غلط تعبیر وتشریح کا یہ امکان ہمیشہ باقی رہے گا۔ انسان کو اس دنیا میں کامل آزادی دی گئی ہے۔ انسان جس طرح دوسری باتوں کے لیے آزاد ہے، اسی طرح وہ قرآن وحدیث کی غلط تشریح کے لیے بھی آزاد ہے، اس برائی سے بچنے کی شرط صرف ایک ہے، اور وہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی خودساختہ تشریح کرے۔

بدتر از حیوان

قرآن کی سورہ الانفال میں ایک غیر مطلوب انسانی کردار کا ذکر ہے۔آیت کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (8:22) قرآن کی اس آیت سے مراد کوئی مخصوص قوم نہیں ہے۔اس سے مراد وہ افراد ہیں جو اس صفت کا مصداق ہوں۔قرآن کی ایک اور آیت کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو: ان کے پاس عقل ہے جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے حیوان، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ، یہی لوگ غافل ہیں (8:179)۔حق کے مقابلے میں اس منفی روش کا سبب، عام طور پر بالقصد انکار نہیں ہوتا بلکہ اس کا سبب غفلت یا بے توجہی (negligence) ہوتا ہے۔جب حق کی بات بتائی جائے تو ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم ہونے کی بنا پر اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے، وہ نہ اس کو توجہ کے ساتھ سنتے ہیں، اور نہ اہمیت کے ساتھ اس پر غور کرتے ہیں۔وہ اس سے بے اعتنائی برت کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔قرآن کے الفاظ میں وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے سنا ہی نہیں (45:8)۔

اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے بطور خود کسی چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے، اور کسی چیز کو غیر اہم، وہ کسی چیز کو قابل غور سمجھتا ہے، اور اس کی نظر میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو قابل غور ہی نہیں۔جن لوگوں کا یہ مزاج ہو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے باہر کسی بات کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کریں۔وہ اپنے سے باہر کسی بات کے بارے میں ایسی روش اختیار کرتے ہیں جیسے کہ انھوں نے اس کو سنا ہی نہیں۔ان کے پاس عقل ہوتی ہے لیکن وہ اپنی عقل کو کہیں اور مشغول کئے ہوئے ہوتے ہیں۔وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ وہ کسی نئی چیز کو اہمیت دیں، اور اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایسے لوگ حیوان کی مانند ہیں، کیوں کہ حیوان بھی یہی کرتا ہے کہ اپنی مانوس چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس پر دھیان دے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

علم کا سفر

قرآن خدا کی کتاب کی حیثیت سے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اترا۔ اس وقت ساری دنیا میں توہم پرستی کا کلچر رائج تھا۔ قرآن کے بعد علمی دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ دور بیسویں صدی عیسوی میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔ قرآن کی صداقت کا یہ علمی ثبوت ہے کہ بعد کی علمی تحقیقات قرآن کی باتوں کی تصدیق بنتی چلی گئیں۔ اس سلسلہ میں برٹش سائنسداں سرجیمس جینز کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> The stream of knowledge is heading towards a non-mechanical reality; the universe begins to look more like a great thought than like a great machine. (*The Mysterious Universe,* James Jeans, p. 137)

یہ بات برٹش سائنسداں نے 1930 میں کہی تھی۔ اس کے بعد کی تمام دریافتیں اس بات کی تصدیق بنتی چلی گئیں کہ حقیقت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے، وہی درست تصور ہے۔ اس درمیان سائنسی دریافتوں کے ذریعہ ملحدانہ تصورات رد ہوتے چلے گئے۔ اور موحدانہ تصورات ثابت شدہ بنتے چلے گئے۔

مثلاً قدیم ملحدین یہ سمجھتے تھے کہ کائنات ابدی ہے، وہ جیسی آج ہے ویسی ہی وہ ابد سے چلی آرہی ہے، اس لیے کائنات کو خالق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر بعد کی سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے۔ 13 بلین سال پہلے بگ بینگ (Big Bang) کی صورت میں کائنات کا آغاز ہوا۔

اسی طرح قدیم ملحدین مانتے تھے کہ کائنات میں کوئی نظم نہیں، مگر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ کائنات میں ایک ذہین ڈیزائن (intelligent design) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی تمام دریافتیں مذہب توحید کی تصدیق کرتی ہیں، خواہ براہِ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔

موت کے دروازے پر

آدمی سمجھتا ہے کہ وہ زندگی میں جی رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد موت کے دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ جب موت کا کوئی وقت مقرر نہیں تو ہر لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ انسان کا ہر اگلا قدم موت کی طرف جانے والا قدم ہے۔ زندگی ہر انسان کے لیے صرف آج کا تجربہ ہے، کل کا تجربہ نہیں۔ ہر آدمی کے لیے آج کا دن زندگی کا دن ہے اور کل کا دن موت کا دن۔

موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف سفر کا نام ہے۔ آدمی روزانہ سفر کرتا ہے۔ کبھی چھوٹا سفر اور کبھی بڑا سفر، کبھی ملک کے اندر سفر اور کبھی ملک کے باہر سفر۔ یہ تمام اسفار ایک معلوم مقام سے چل کر دوسرے معلوم مقام تک جانے کے ہم معنی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سفروں سے آدمی اتنا زیادہ مانوس ہو چکا ہے کہ وہ اس کو کوئی سنگین چیز نہیں سمجھتا۔

لیکن موت کے سفر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ موت کے سفر میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک معلوم دنیا سے نکل کر دوسری نامعلوم دنیا کی طرف جاتا ہے۔ یہ بلاشبہہ ہر آدمی کے لیے ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے۔ مگر آدمی اپنی کنڈیشننگ کی وجہ سے اس کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں جن اسفار کا تجربہ کرتا ہے، ان سے وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ گہرے شعور کے تحت، موت کے سفر جیسے سفر کا ادراک نہیں کر پاتا۔ اسی بنا پر ہر آدمی کے لیے موت ایک دور کی خبر بنی ہوئی ہے، وہ اس کے لیے قریب کا کوئی واقعہ نہیں۔

آدمی اپنے مزاج کی بنا پر ہمیشہ کنڈیشننگ کے تحت سوچتا ہے۔ یہی انسان کی بے حسی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ موت کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی کنڈیشننگ کو توڑے، وہ اپنے مانوس ذہن سے باہر آ کر موت کے بارے میں سوچے، وہ اپنے شعور کو کامل طور پر بیدار کرے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آدمی موت کی حقیقت کو سمجھے، جو بلاشبہہ ہر انسان کا سب سے زیادہ سنگین معاملہ ہے۔

شکایت، اعتراف

نفسیات کے اعتبار سے کسی انسان کے لئے سب سے زیادہ آسان کام دوسروں کی شکایت (complaint) ہے، اور سب سے زیادہ مشکل کام دوسروں کا اعتراف (acknowledgment) ہے۔ یہ بات انسان کی نسبت سے ہے۔ لیکن جہاں تک فطرت کے قانون کا تعلق ہے، فطرت کے قانون کے مطابق دوسروں کی شکایت کرنے کا ذہن انسان کے اندر اعلیٰ شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے برعکس، دوسروں کا اعتراف کرنے کا ذہن انسان کے اندر اعلیٰ شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ معاون عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

کیوں ایسا ہے کہ دوسروں کی شکایت نہایت آسان ہے اور دوسروں کا اعتراف بے حد مشکل۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شکایت کا مطلب دوسروں کی نفی (negation) ہے، اور اعتراف کا مطلب خود اپنی نفی ہے۔ جب آدمی کسی دوسرے کی شکایت کرتا ہے تو اس کو ایسا کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسرا شخص برا ہے اور میں اچھا ہوں۔ اس کے برعکس، دوسرے کا اعتراف کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں بلکہ دوسرا شخص اچھا ہے۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری خودی ہے۔ شکایت کرتے ہوئے آدمی کو اپنی خودی کے جذبے کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دوسرے کا اعتراف کرتے ہوئے آدمی کی خودی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہی فرق ہے جس کی بنا پر لوگوں کے لیے شکایت کرنا سب سے زیادہ آسان کام بن گیا ہے، اور اعتراف کرنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں آدمی کے لئے امتحان کے پرچے ہیں۔ شکایت کا موقع بھی امتحان ہے، اور اعتراف کا موقع بھی امتحان۔ جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ دوسروں کی شکایت تو کرے مگر وہ دوسروں کا کھلا اعتراف نہ کرے، ایسا آدمی آزمائش میں ناکام ہوگیا۔ ایسا آدمی اللہ کی رحمت کا مستحق نہیں بن سکتا۔

حقیقت پسندانہ سوچ

دنیا میں جو برائیاں (evils) ہیں ان سب کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے لوگوں میں اَیز اِٹ از تھنکنگ (as it is thinking) نہ ہونا۔ غصہ، نفرت، انتقام، عدم برداشت، تشدد وغیرہ سب کی اصل جڑ یہی ہے۔ ایز اٹ از تھنکنگ کا مطلب ہے مبنی بر حقیقت سوچ۔

غور کیا جائے تو یہی وہ چیز ہے جس کو شیطان کا کلچر (satanic culture) کہا گیا ہے۔ شیطان یا ابلیس جنوں کا سردار تھا۔ پیدائش آدم کے وقت اس نے یہ اعتراض اٹھایا کہ خدا نے انسان کو خلیفۃ الارض بنادیا اور جنات کو کچھ نہیں دیا۔ یہ انتخابی طرز فکر کی پہلی مثال تھی۔ جنّ کو جو اختیارات دیے گئے تھے اس کے لحاظ سے گویا وہ خلیفۃ الکون تھا۔ مگر ابلیس نے یہ کیا کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا تھا، اس کا اعتراف نہیں کیا، اور جو کچھ انسان کو دیا گیا تھا اسی کا ذکر یک طرفہ طور پر کیا۔ اسی یک طرفہ طرز فکر سے ساری برائیاں پیدا ہوئیں۔ ابلیس کا یہی کلچر آج تک ساری دنیا میں جاری ہے۔

سارے انسانوں کی مشترک برائی بتانا ہو تو وہ صرف ایک ہوگی۔ اور وہ انتخابی سوچ (selective thinking) ہے۔ ہر عورت اور مرد یہ کرتے ہیں کہ اپنے بارے میں ایک ڈھنگ سے سوچتے ہیں، اور دوسرے کے بارے میں دوسرے ڈھنگ سے۔ اپنے آپ کو ایک معیار سے جانچتے ہیں، اور دوسرے کو دوسرے معیار سے۔ اپنی پسند کو لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو وہ ان کی صرف اچھائیاں بیان کریں گے، اور اگر ان لوگوں کا ذکر کرنا ہو جو انھیں پسند نہیں ہیں تو ان کی صرف برائیاں بیان کریں گے۔ ایک قوم کے بارے میں وہ منفی رپورٹنگ (negative reporting) کریں گے، اور دوسری قوم کے بارے میں صرف مثبت رپورٹنگ (positive reporting)۔ ایک گروہ ان کو ظالم نظر آئے گا اور دوسرا گروہ مظلوم دکھائی دے گا۔ ایک کے لئے ان کے دل میں صرف نفرت ہوگی، اور دوسرے کے لئے صرف محبت — یہی وہ چیز ہے جس نے لوگوں کو حقیقت پسندانہ سوچ (realistic approach) سے محروم کر دیا ہے۔

1۔ ترجمۂ کتب:

• اب گڈورڈ بکس سے قرآن کا ترجمہ اسپینش، فرنچ اور اٹالین زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ چائنیز زبان میں ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔

• صدر اسلامی مرکز کی انگریزی کتاب *The Prophet of Peace* کا ترجمہ انڈونیشی زبان میں ہو چکا ہے۔

• غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے والی صدر اسلامی مرکز کی ایک بہترین انگریزی کتاب *What is Islam* کو ان زبانوں میں ٹرانسلیٹ کیا جا چکا ہے، فرنچ، جرمن، اسپینش، اور فلپائن کے اکثریت کی زبان تغالوگ (Tagalog)، وغیرہ۔

• پیغمبرِ اسلام کی دعوتی زندگی پر مشتمل صدر اسلامی مرکز کی کتاب مطالعہ سیرت کا سندھی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جناب یوسف سندھی نے سی پی ایس پاکستان کے تعاون سے یہ ترجمہ کیا ہے۔

2۔ دعوتی سرگرمیاں:

• دعوت کا ایک اہم مقام بک فیر ہے۔ اس لیے الرسالہ مشن سے وابستگی رکھنے والے داعی نیشنل اور انٹرنیشنل پیمانے پر منعقد ہونے والے بک فیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جن انٹرنیشنل بک فیر میں شرکت کی گئی، وہ یہ ہیں: شارجہ انٹرنیشنل بک فیر (15-5 نومبر 2014)، کراچی بک فیر (22-18 دسمبر 2014)، مسقط انٹرنیشنل بک فیر (27 فروری تا 7 مارچ 2015)، لاہور بک فیر (9-5 فروری 2015)، بنکاک انٹرنیشنل بک فیر (27 مارچ تا 6 اپریل 2015)۔ انڈیا کے اندر جیسے دہلی ورلڈ بک فیر (22-14 فروری 2015)، علی گڑھ بک فیر، وغیرہ۔ ان تمام جگہوں پر لوگوں نے قرآن اور الرسالہ مشن کی دعوتی کتابوں کو کافی شوق سے حاصل کیا۔

• سہارن پور کے کمپنی گارڈن میں 14 مارچ 2015 کو ایک سرکاری پروگرام ہوا۔ پروگرام میں شریک ہونے والے تمام اعلی سرکاری افسران کو سی پی ایس سہارن پور کی جانب سے ترجمۂ قرآن اور دعوتی لٹریچر کا ایک ایک سیٹ دیا گیا۔

• بہار کے دلسنگھ سرائے (سمستی پور) میں 1 مارچ 2015 کو ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ جس میں بہار سی پی ایس ٹیم کے جناب دانیال صاحب نے اسلام اور امن کے موضوع پر لکچر دیا۔ تقریر کے بعد تمام حاضرین کو ہندی ترجمۂ قرآن اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

• ممبئی ٹیم نے 15-14 مارچ 2015 کو بیڑ مہاراشٹر کا دوروزہ دعوتی دورہ کیا۔ یہ دورہ بہت ہی کامیاب رہا۔ ایک ہندو ڈاکٹر نے اس پیس مشن کو دیکھ کر کہا کہ آپ لوگوں کے آنے سے پہلے میں مسلمانوں کی انتہا پسندانہ

حالت کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ایسے انتہا پسند لوگ پہلے غیر مسلموں کو قتل کریں گے، پھر آپس میں ایک دوسرے کو ماریں گے۔ آپ کے آنے سے میرے لیے امید کی کرن پیدا ہوئی ہے، میں بہت خوش ہوں۔

● سی پی ایس کولکاتا نے 22-21 مارچ 2015 کو آسنسول اور کلٹی کا دعوتی دورہ کیا۔ یہ پروگرام الرسالہ کے قارئین سے ملاقات کے لیے تھا۔ اس دورہ سے تحریک پا کر دونوں جگہوں میں مقامی ٹیم کا قیام عمل میں آیا۔

● ڈاکٹر راجیش سروادنیا فاؤنڈر آف وویکانندا یوتھ کنکٹ (ممبئی) نے 26 مارچ 2015 کو صدر اسلامی مرکز کی اسپریچولٹی پر ایک ویڈیو اسپیچ ریکارڈ کی۔ دوران تقریر صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں انڈیا اسپریچول سپر پاور بن کر ابھرے گا، نوجوانوں کو اس کے لیے کوشش کرنی چاہئے۔

● سی پی ایس انٹرنیشنل دہلی کے زیر اہتمام 2 اپریل 2015 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں گلوبل چیپٹرس میٹ رکھی گئی تھی۔ اس پروگرام کا افتتاح صدر اسلامی مرکز نے کیا۔ اس میں تین کتابوں کا رسم اجرا کیا گیا۔ یہ کتابیں ہیں: اسلام اینڈ ورلڈ پیس (انگریزی ترجمہ امن عالم)، اسلامی جہاد (کتابچہ) اور شہادت: امت مسلمہ کا مشن (کتابچہ)۔ اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک کے نمائندوں نے اپنے اپنے مقامات پر ہونے والی دعوتی سرگرمیوں اور تجربات سے لوگوں کو باخبر کیا نیز مستقبل کے لائحہ عمل پر تبادلہ خیال ہوا۔

3۔ الرسالہ مشن کے متعلق تاثرات:

● مالدیپ اسلامی افیرس کے ڈپٹی وزیر محمد قبادابوبکر 17 مارچ 2015 کو گڈ ورڈ بکس، چنئی میں آئے اور الرسالہ مشن کی آئڈیالوجی پر تبادلۂ خیال کیا۔ دوران گفتگو انھوں نے یہ کہا کہ نوجوانی کے دنوں میں مجھے جماعت اسلامی کی باتیں اچھی لگتی تھیں، لیکن اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ الرسالہ مشن کی آئڈیالوجی ہی فطری آئڈیالوجی ہے۔

● I have been distributing Maulana's book, *Khandani Zindagi* among some women since the past two years. It has become very popular. Recently, I received a message from one of the women, who requested me to send more of Maulana's books, including *Tabir ki Ghalati* and *The Secret of a Successful Family Life*.

کشن گنج (بہار) میں ماہ نامہ الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

CPG Messege Forum

At+P.O. Bahadurganj, Main Road, Dist. Kishanganj-855101, Bhihar

Mob. 9470272115, 9430900563

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

- اللہ اکبر
- اتحاد ملت
- احیاء اسلام
- اسباق تاریخ
- اسفار ہند
- اسلام: ایک تعارف
- اسلام: ایک عظیم جدوجہد
- اسلام اور عصر حاضر
- اسلام پندرہویں صدی میں
- اسلام دور جدید کا خالق
- اسلام دین فطرت
- اسلام کا تعارف
- اسلام کیا ہے
- اسلامی تعلیمات
- اسلامی دعوت
- اسلامی زندگی
- اظہارِ دین
- اقوالِ حکمت
- الاسلام
- الربانیہ
- امن عالم
- امہات المومنین (ڈاکٹر فریدہ خانم)
- انسان اپنے آپ کو پہچان
- انسان کی منزل
- ایمانی طاقت
- آخری سفر
- باغ جنت
- پیغمبر اسلام
- پیغمبر انقلاب
- تذکیر القرآن
- تاریخ دعوت حق
- تاریخ کا سبق
- تبلیغی تحریک
- تجدید دین
- تصویر ملت
- تعارف اسلام
- تعبیر کی غلطی
- تعدد ازدواج
- تعمیر انسانیت
- تعمیر حیات
- تعمیر کی طرف
- تعمیر ملت
- حدیث رسول
- حقیقت حج
- حقیقت کی تلاش
- حکمتِ اسلام
- حل یہاں ہے
- حیات طیبہ
- خاتونِ اسلام
- خاندانی زندگی (پمفلٹ)
- خدا اور انسان
- خلیج ڈائری
- دعوت اسلام
- دعوت حق
- دین انسانیت
- دین کامل
- دین کی سیاسی تعبیر
- دین کیا ہے
- دین و شریعت
- دینی تعلیم
- ڈائری 1983-84
- ڈائری 1989-90
- ڈائری 1991-92
- ڈائری 1993-94
- رازِ حیات
- راہ عمل
- راہیں بند نہیں
- روشن مستقبل
- رہنمائے حیات (پمفلٹ)
- رہنمائے حیات
- زلزلہ قیامت
- سبق آموز واقعات
- سچا راستہ
- سفرنامہ اسپین و فلسطین
- سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
- سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
- سوشلزم اور اسلام
- سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
- سیرتِ رسول
- شتم رسول کا مسئلہ
- صراطِ مستقیم
- صوم رمضان
- طلاق اسلام میں
- ظہور اسلام
- عظمت اسلام
- عظمت صحابہ
- عظمت قرآن
- عظمتِ مومن
- عقلیاتِ اسلام
- علماء اور دور جدید
- عورت معمارِ انسانیت
- فسادات کا مسئلہ
- فکر اسلامی
- قال اللہ و قال الرسول
- قرآن کا مطلوب انسان
- قیادت نامہ
- کاروانِ ملت
- کتابِ زندگی
- کتابِ معرفت
- کشمیر میں امن
- مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
- مذہب اور جدید چیلنج
- مذہب اور سائنس
- مسائل اجتہاد
- مضامین اسلام
- مطالعۂ حدیث
- مطالعۂ سیرت (پمفلٹ)
- مطالعۂ سیرت
- مطالعۂ قرآن
- منزل کی طرف
- مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک (ڈاکٹر فریدہ خانم)
- میوات کا سفر
- نار جہنم
- نشری تقریریں
- نئے عہد کے دروازے پر
- ہندستان آزادی کے بعد
- ہندستانی مسلمان
- ہند-پاک ڈائری
- یکساں سول کوڈ

Date of Posting 10th and 11th of advance month Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
Published on the 1st of every month RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17